رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۴۰۳

شعبان المعظم ۱۳۷۰ھ | جلد ۳۶ ۔ عدد ۴

ترجمان القرآن

مرتبہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ۔ لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی پرچہ دس آنے

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین پر مولانا نے ہر طرح کے سوالات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

جلد شائع ہو رہی ہے

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ملنے کا پتہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور

ترجمان القرآن

فہرست مضامین

عدد ۲	شعبان ۱۳۷۰ھ — مطابق — جون ۱۹۵۱ء	جلد ۳۶

سید ابوالخیر مودودی نے مرکنٹائل پریس ہیمرلین روڈ سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِشارات

قراردادِ مقاصد کے پاس ہونے کا فائدہ صرف یہی نہیں ہوا کہ مسلم قوم اور پاکستانی مملکت کا نصب العین واضح صورت میں متعین ہوگیا اور اس نے ایک پختہ آئینی شکل اختیار کرلی جس کا بدلنا اب ممکن نہیں رہا ہے، بلکہ اس کا دوسرا، اور اس سے بھی زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا کہ مملکتِ پاکستان اصولاً ایک اسلامی مملکت میں تبدیل ہوگئی۔ اس دوسرے فائدے کی اہمیت بھی وہ لوگ ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے ہیں جنہیں آئینی مسائل کا فہم حاصل نہیں ہے، اور اسی بنا پر ان کی سمجھ میں اب تک یہ بھی نہیں آیا ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے اس مملکت کی حیثیت میں اس قرارداد کی بدولت کیا بنیادی فرق واقع ہوگیا ہے۔ لیکن ہم نے چونکہ تمام آئینی و شرعی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد خوب سوچ سمجھ کر یہ سوال اٹھایا تھا، اس لئے ہم پر اس کے سیاسی اور اخلاقی نتائج ہی نہیں، قانونی اور شرعی نتائج بھی پوری طرح روشن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قرارداد کے پاس ہوتے ہی جماعتِ اسلامی نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور اپنے دستور، پالیسی اور طریقِ کار میں اس تغیّر کا اعلان کردیا جو مملکت کی آئینی حیثیت کے تغیّر سے ٹھیک مطابقت رکھتا تھا۔

یہ معاملہ چونکہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس نے ہماری تحریک کے راستے کو اصولاً اور عملاً بالکل بدل دیا ہے اس لئے ہم اس کی تھوڑی سی توضیح کریں گے تاکہ سمجھ بوجھ رکھنے والے اصحاب اس کو اور ہماری تحریک کی رفتارِ مابعد کو اچھی طرح جان لیں۔

جس ریاست کا دستور تحریری شکل میں مدوّن نہ ہو اُس کے اسلام و کفر کو متعین کرنے کا سوال تو ذرا پیچیدہ ہوتا ہے، لیکن ایک تحریری دستور رکھنے والی ریاست کا معاملہ بالکل صاف ہوتا ہے کیونکہ اُس کا دستور خود اس امر کی شہادت دے دیتا ہے کہ وہ ایک مسلم ریاست ہے یا کافر ریاست

اگر کسی ریاست کا دستور صریح طور پر اپنے کفر کی گواہی دے رہا ہو تو اس کے کارپردازوں اور کارفرماؤں میں محض مسلم افراد کی صورتیں دیکھ کر یا ان کی دعوائے اسلام سے بھری ہوئی تقریریں سن کر اس کے مسلم ریاست ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس ریاست کے ساتھ وہ معاملہ کیا جا سکتا ہے جو شرعاً صرف ایک مسلم ریاست ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک شخص اگر خود اپنی زبان سے مسلم ہونے کا انکار اور غیر مسلم ہونے کا اقرار کر رہا ہو تو ہمارے لئے یہ ممکن نہیں رہتا کہ ہم اس کی زبان سے بعض اسلامی خیالات سن کر اور اس کی زندگی میں بعض اسلامی علامات دیکھ کر اسے مسلمان مان لیں اور اسے نماز میں امام بنا تا یا کسی مسلمان لڑکی سے اس کا نکاح کرنا قبول کر لیں۔ اس طرح کے سارے معاملات اس کے ساتھ بہرحال اس وقت تک نہیں کئے جا سکتے جب تک کہ وہ زبان ہی سے شہادت اسلام ادا نہ کرے۔ ٹھیک ایسا ہی معاملہ ایک غیر اسلامی دستور پر مبنی مملکت کا بھی ہے کہ جب تک اس کی آئینی زبان شہادت اسلام ادا نہ کرے ہم نہ اس کو اسلامی مملکت کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کے ساتھ وہ روابط قائم کر سکتے ہیں جو شرعاً صرف ایک اسلامی مملکت ہی کے ساتھ رکھے جا سکتے ہیں، خواہ اس کی ساری آبادی مسلمان ہو اور اس کے سارے کارفرما و کارپرداز بھی مسلمان ہی ہوں۔

پاکستان بننے سے پہلے متحدہ ہندوستان میں جو مملکت قائم تھی اس کا دستور صریح طور پر ایک کافرانہ دستور تھا۔ اس میں اسلامی ریاست کی کسی خصوصیت کا شائبہ تک موجود نہ تھا۔ اس لئے اس میں ہماری پوزیشن یہ تھی کہ ہم اس کی تمام ملازمتوں کو اصولاً حرام سمجھتے تھے، اس کے قانون کو جائز قانون تسلیم نہ کرتے تھے، اس کی عدالتوں میں جج، وکیل یا مدعی کی حیثیت سے جانے کو شرعاً ممنوع خیال کرتے تھے، اس کی مجالس قانون ساز کی رکنیت اور اس کے انتخابات میں حصہ لینے کو اسلام کے منافی قرار دیتے تھے، اور ہمارا عقیدہ یہ تھا کہ ایسی ریاست میں سانس لینا بھی ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے الّا یہ کہ وہ اسے دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرے، اور اس جدوجہد کی غرض سے

ٹھیرنے کی صورت میں بھی ہم اس ریاست کے نظم ونسق اور اس کے قوانین سے صرف اتنے تعلق کو جائز سمجھتے تھے جتنا موجودہ دور کی ایک مملکت میں جینے اور اقامتِ دین کا کام کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ علاوہ بریں اُس ریاست کو "دارالاسلام" میں تبدیل کرنے کی جدوجہد بھی ہم ان طریقوں سے نہ کرسکتے تھے جو موجودہ زمانے کی اصطلاح میں "آئینی طریقے" کہلاتے ہیں، کیونکہ انتخابات میں حصہ لینا ہمارے نزدیک شرعاً صحیح نہ تھا۔ اس لئے ہم نے "پُرامن، غیر خفیہ، انقلابی دعوت" کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب سیاسی انقلاب رونما ہُوا اور اس کے نتیجہ میں پاکستان کی مملکت بنی تو ایک سخت پیچیدہ صورتِ حال پیش آگئی۔

مملکت زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی جو بالعموم اپنی قومی ریاست کو اسلامی ریاست دیکھنے کے خواہشمند تھے اور یہ چیز اس بات کی متقاضی تھی کہ ہم اس کی تعمیر و تشکیل میں اپنی قوم کی پوری مدد کریں۔ دستورِ مملکت جوں کا توں وہی کافرانہ دستور تھا جو سابق انگریزی حکومت چھوڑ گئی تھی، اور اس کی وجہ سے نہ شرعاً اس نئی مملکت کی حیثیت پچھلی غیر اسلامی مملکت سے مختلف قرار دی جاسکتی تھی اور نہ اس کے ساتھ کوئی مختلف رویہ اختیار کیا جاسکتا تھا۔

باشندگانِ ملک کے نمائندوں پر مشتمل ایک دستور ساز اسمبلی بنا دی گئی تھی جسے یہ طے کرنا تھا ــــ اور آئینی طور پر صرف وہی یہ طے کرنے کی مجاز تھی ــــ کہ ملک کا مستقل دستور کیا ہو، مگر اس نے نہ تو سابق دستور میں کوئی اصولی ترمیم کی (حالانکہ جزوی ترمیمات بہت سی کیں اور کرتی رہی)، اور نہ آئندہ ہی کے متعلق یہ ظاہر کیا کہ وہ ملک کا جدید نظام کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔

یہی وہ پیچیدگی تھی جسے بالآخر قرارداد مقاصد نے رفع کیا۔ اصولاً ایک تحریری دستور رکھنے والے ملک میں صرف اس کی دستور ساز اسمبلی یا اسی نوعیت کے اختیارات رکھنے والی کوئی مجلس ہی وہ آئینی زبان ہوسکتی تھی جس سے شہادتِ اسلام ادا ہونے پر اسے اسلامی ریاست قرار دیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ جس تاریخ کو اس نوزائیدہ مملکت کی آئینی زبان سے یہ شہادت ادا ہوئی اسی روز جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ

نے اُس کے ایک اسلامی مملکت ہونے کو تسلیم کر لیا اور ٹھیک ۲۴ روز بعد پوری آئینی پوزیشن کا جائزہ لے کر یہ اعلان کیا کہ اب اس ریاست کی شرعی حیثیت سابق غیر مسلم ریاست سے بالکل مختلف ہو چکی ہے۔ اب اس کی ملازمت جائز ہے، اس کے قوانین اپنی عارضی نوعیت میں قابلِ تسلیم ہیں۔ اس کی عدالتوں میں جانا حلال ہے، اور اس کی اسمبلی و پارلیمنٹ کے انتخابات میں ہر حیثیت سے حصہ لیا جا سکتا ہے۔ اس دستوری تغیر کے ساتھ جماعت نے اپنی پالیسی میں بھی یہ تغیر کیا کہ وہ آئندہ اس ملک کے انتخابات میں حصہ لے کر آئینی طریقوں سے اس کو مکمل دارالاسلام بنانے کی کوشش کرے گی — یہ ہماری تحریک کی تاریخ میں ایک اہم نقطۂ انقلاب تھا جس نے ہمارے لئے ایک طریقِ کار کے بجائے دوسرے طریقِ کار کا دروازہ کھول دیا۔ اب ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بن جانے کے بعد یہ دارِ عدو نہیں رہی جس کے خلاف جدوجہد کرنا ہمارا کام ہو، بلکہ دارِ دوست، ہمارا اپنا دار بن گئی جسے بنانا، سنوارنا اور ترقی دینا ہمارا کام ہو گیا۔

اس کے بعد سے جماعت جس لائحہ عمل پر کام کر رہی ہے وہ چار بڑے بڑے مقاصد پر مشتمل ہے۔

اوّل یہ کہ اس مملکت کو ان تمام فکری اور عملی رجحانات سے بچایا جائے جو اسے اسلام کے راستہ سے منحرف کرنے والے ہیں۔

دوم یہ کہ عوام الناس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح کی جائے یہاں تک کہ ہمارا معاشرہ جاہلیت کی بنیادوں سے ہٹ کر اسلام کی صالح بنیادوں پر قائم ہو اور اس قابل بن جائے کہ اس میں برائیاں دب رہیں اور بھلائیاں نشوونما پا سکیں۔

سوم یہ کہ ہماری اس نئی مملکت کی تعمیر لازماً انہی بنیادوں پر ہو جو قرارداد مقاصد میں متعین کر دی گئی ہیں اور کسی ایسی تدبیر کو نہ چلنے دیا جائے جو قرارداد مقاصد کو بالائے طاق رکھ کر یہاں ایک غیر اسلامی طرز کا نظامِ حکومت قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائے۔

چہارم یہ کہ آئینی ذرائع سے اس مملکت کی موجودہ قیادت کو ایک صالح قیادت سے تبدیل کیا جائے

اور اسے بروئے کار لا کر قوانین، نظم و نسق تعلیم، مالیات، معاشی نظام، فلاح عمومی، دفاع اور خارجی سیاست میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے پاکستان دنیا میں اسلام کی صحیح نمائندہ ریاست بن جائے۔

ہمارے پروگرام کو اس لحاظ سے تقسیم کرنا تو مشکل ہے کہ ان مقاصد میں سے ہر مقصد کے لئے جو کام ہم کر رہے ہیں اس کو الگ الگ بیان کیا جا سکے۔ کیونکہ یہ سب مقاصد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے لئے کوئی ایسا کام نہیں کیا جا سکتا جو دوسرے مقاصد کی خدمت نہ کرتا ہو۔ تاہم بیان کوشش کی جائے گی کہ ان میں سے ہر مقصد کی تھوڑی سی تشریح کر کے یہ بتایا جائے کہ اس کی خدمت کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں اور آگے کرنا چاہتے ہیں۔

گمراہی کی تحریکوں میں سے جماعت صرف بڑی اور بنیادی گمراہیوں کی طرف متوجہ ہے۔ باقی رہیں چھوٹی گمراہیاں تو وہ درحقیقت طفیلی ہیں، اپنے بل بوتے پر قائم نہیں ہیں بلکہ کسی نہ کسی بڑے شجر خبیث کی جڑوں سے غذا حاصل کر رہی ہیں اور اسی کے سہارے جی سکتی ہیں۔ اسی لئے جماعت نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک اُس خطرے کو بھانپ رہی ہے جو جماعت کے کامیاب ہونے کی صورت میں اسے لاحق ہو سکتا ہے۔ جماعت اس بات کو خوب سمجھتی ہے کہ یہاں اسلام کی اصل مزاحم دو ہی طاقتیں ہیں:

ایک اشتراکیت، جس کے پاکستانی علمبردار چاہے بہت طاقتور نہ ہوں مگر اس کی پشت پر ایک عالمگیر تحریک اور ایک زبردست لٹریچر اور ایک جہاں کشا فوجی طاقت ہے۔ یہی چیز ہے جو ہمارے لئے درجۂ اوّل کا خطرہ بناتی ہے۔ اس کے نظریات سے محض کھلے کھلے اشتراکی ہی متاثر نہیں ہیں بلکہ وہ ایک بادی زہر کی طرح پوری اجتماعی فضا میں سرایت کئے ہوئے ہیں۔ طلبہ، پروفیسر، ادیب، اخبار نویس، سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اور کارکن، فوجی افسر، سول محکموں کے عہدہ دار، غریب عوام، مزدور اور کسان، حتیٰ کہ بہت سے مذہبی لوگ بھی دانستہ یا نادانستہ ان نظریات سے مغلوب، متاثر اور مانوف ہیں۔ ان نیم اشتراکیوں کی نہ تعداد کسی کو معلوم ہے نہ ان کی اقسام ہی کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں

کی بھی ہے جو اشتراکیت اور اشتراکیوں پر تو لعنت بھیجتے ہیں مگر خود اشتراکی دماغ سے سوچتے اور اشتراکی زبان میں کلام کرتے ہیں اور قرآن و حدیث تک سے اشتراکیت نچوڑ لاتے ہیں۔

دوسری مزاحم طاقت مغربی الحاد و فسق اور اباحیت ہے جو ہمارے اس ملک میں ڈیڑھ سو برس کی تاریخ رکھتی ہے، جسے انگریزی تعلیم و تہذیب اور سیاست نے مدت دراز تک دودھ پلا پلا کر پالا ہے، جسے چلتے چلتے انگریز اپنے خلف الصدق کی حیثیت سے مسندِ اقتدار سونپ گیا ہے، اور جسے یہاں مغربی طاقتوں کی پشتیبانی بھی حاصل ہے۔ پھر چاہے سیاسی مقاصد اور معاشی اغراض میں اِسکے اور اشتراکیت کے درمیان کتنے ہی اختلافات ہوں مگر دونوں ایک ہی مادہ تہذیب کی پیداوار ہیں اور الحاد و فسق اور اباحیت میں اشتراکی اور غیر اشتراکی متفرنجین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسلئے جہاں تک حقیقی اسلام کے نفوذ و قیام کا راستہ روکنے کا تعلق ہے، دونوں اس کام میں متحد ہیں؛ اور ان کی متحدہ کوشش یہ ہے کہ یہاں "اسلام" کے نام سے ایک ایسی تہذیب اور ایسے تمدن کو رائج کیا جائے جو اپنی کسی خصوصیت میں امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے تمدن و تہذیب سے مختلف نہ ہو اور جس میں اسلام کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے کوئی حد قائم نہ رہنے۔

جماعت اسلامی کا اصل تصادم انہی دو طاقتوں سے ہے۔ علماء کرام خواہ مخواہ بیچ میں آ کھڑے ہوئے ہیں یا "ہوّا" بنا کر لا کھڑے کئے گئے ہیں۔

کوئی تہذیبی و تمدنی حرکت جمود کی چٹانوں سے نہیں روکی جا سکتی۔ اس کو اگر روک سکتی ہے تو ایک متقابل کی تہذیبی و تمدنی حرکت ہی روک سکتی ہے۔ ہمارے ہاں اب تک سیلابوں کا مقابلہ چٹانیں کرتی رہی ہیں۔ اسی لئے ہمارے ملک سمیت قریب قریب تمام مسلمان ملک مغرب کے فکری و تہذیبی سیلابوں میں غرق ہوتے چلے گئے ہیں۔ اب ہم حرکت کا مقابلہ حرکت سے اور سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب سے کر رہے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ساری کھوئی ہوئی زمین واپس لے سکیں گے۔ ہماری تحریک کسی ایک گوشے یا ایک میدان میں ان ضلالتوں کا مقابلہ نہیں کر رہی ہے بلکہ ہر میدان میں ہمارا اور ان کا تصادم ہے۔ ہم نے ان کے تمام نظریات اور عملی طریقوں پر تنقید کی ہے اور ان کی کمزوریاں کھول کھول کر سامنے رکھ دی ہیں، ہم نے ہر مسئلۂ زندگی کا حل ان کے حل کے جواب میں پیش کیا ہے اور

دلائل لائے جو انکو معقول ثابت کرنے والے ہیں، ہم انکے ادب کے مقابلہ میں ایک صالح ادب لائے ہیں، انکے فلسفے کے مقابلہ میں ایک بہتر فلسفہ لائے ہیں، انکی سیاست کے مقابلہ میں ایک زیادہ مضبوط سیاست لائے ہیں، اور ہماری صفوں میں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف قال اللہ وقال الرسول جاننے والے ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے ساتھ قال ہیگل وقال مارکس وقال فرائڈ بھی انہی کے برابر جاننے والے ہیں۔ درس گاہوں میں جہاں ان کی فکر اور تہذیب کی اشاعت کرنے والے موجود ہیں وہیں انہی کی ٹکر کے فکری و تہذیبی مبلغ ہماری طرف سے بھی موجود ہیں حکومت کے ہر شعبے میں اُن کا زہر پھیلانے والے اگر اپنا کام کر رہے ہیں تو ہمارے تریاق کے حاملین بھی بیکار نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کو نکالنے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے لیکن اب خدا کے فضل سے ان سب کو چن چن کر نکال پھینکنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اور انشاء اللہ تجربہ ثابت کر دیگا کہ کسی متحرک نظام فکر و عمل کے متاثرین کو چن چن کر چھانٹ پھینکنا صرف ایک بیوقوف ہی ممکن العمل سمجھ سکتا ہے ۔۔۔ سوسائٹی کے ہر طبقے میں ان کے اثرات کے بالمقابل ہمارے اثرات بھی کم یا زیادہ کارفرما ہیں، مزدور اور کسان اور محنت پیشہ عوام جواب تک ان کا اجارہ بنے ہوئے تھے، بتدریج انکے اثر سے نکل کر ہمارے اثر میں آتے جا رہے ہیں۔ اور ایک طاقتور رائے عام غیر اسلامی افکار و اخلاق و اطوار کے خلاف تیار ہوتی جا رہی ہے۔ ان سب پر مزید یہ کہ انقلاب قیادت کے لئے ہماری تحریک کی زد براہ راست اُس اقتدار پر پڑتی ہے جس کے سہارے یہاں محض فرنگیت ہی نہیں، دوسری تمام چھوٹی بڑی ضلالتیں بھی پرورش پا رہی ہیں پھر اس کشمکش کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس کے دونوں فریق اپنے اپنے نظریات ہی کی نمائندگی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس مخصوص کیرکٹر کی بھی نمائندگی کر رہے ہیں جو ان نظریات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے ایک طرف اگر اشتراکی اپنے اشتراکی اخلاق اور متفرنجین اپنی فرنگی سیرت کے ساتھ میدان میں موجود ہیں تو دوسری طرف جماعت اسلامی بھی خالی خولی تقریریں اور تحریریں اور اجتماعی سرگرمیاں لئے ہوئے سامنے نہیں آگئی ہے بلکہ وہ انفرادی سیرت اور جماعتی اخلاق بھی ساتھ لائی ہے جو اسلام کی اگر مکمل نہیں تو کم از کم صحیح نمائندگی ضرور کرتا ہے اس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچ رہے ہیں وہاں اسلامی خیالات کے ساتھ اسلامی تہذیب اور اسلامی اطوار کا مظاہرہ پورے فخر کے ساتھ سر اونچا کرتے ہوئے کیا جا رہا ہے، اور وہ کیفیت دُور ہو رہی ہے کہ ماڈرن سوسائٹی میں ایک شخص نماز تک چھپتے ہوئے پڑھتا تھا اور ایک خاتون برقع اوڑھنے پر لاکھ معذرتیں کرنے کے بھی ڈرتی تھی کہ نہ معلوم تاریک خیالی کا دھبا اسکے دامن سے مٹایا نہیں

۴۹ء اور ۵۰ء میں ہم نے ان ضلالتوں کے مقابلہ کیلئے اپنے پچھلے لٹریچر پر جن چیزوں کا اضافہ کیا وہ یہ ہیں:-

۱۔ سود حصہ دوم۔ ۲۔ مسئلہ ملکیت زمین ۳۔ قومی ملکیت ۴۔ پاکستانی عورت دوراہے پر۔

تفہیم القرآن

الحجر

نام | چھٹے رکوع کی پہلی آیت کَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نزول | مضامین اور انداز بیان سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ اس سورہ کا زمانۂ نزول سورۂ ابراہیم سے متصل ہے۔ اس کے پس منظر میں دو چیزیں بالکل نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت دیتے ایک مدت گزر چکی ہے اور مخاطب قوم کی مسلسل ہٹ دھرمی، استہزاء، مزاحمت اور ظلم و ستم کی حد ہو گئی ہے جس کے بعد اب تفہیم کا موقع کم اور تنبیہ و انذار کا موقع زیادہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوم کے کفر و جمود اور مزاحمت کے پہاڑ توڑتے توڑتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھکے جا رہے ہیں اور دل شکستگی کی کیفیت بار بار آپ پر طاری ہو رہی ہے، جسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی دے رہا ہے اور آپ کی ہمت بندھا رہا ہے۔

موضوع اور مرکزی مضمون | یہی دو مضمون اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی تنبیہ ان لوگوں کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا انکار کر رہے تھے اور آپ کا مذاق اڑاتے اور آپ کے کام میں طرح طرح کی مزاحمتیں کرتے تھے۔ اور تسلی و ہمت افزائی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورہ تفہیم اور نصیحت سے خالی ہے۔ قرآن میں کہیں بھی اللہ تعالیٰ نے محض تنبیہ یا خالص زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا ہے۔ سخت سے سخت دھمکیوں اور ملامتوں کے درمیان بھی وہ سمجھانے اور نصیحت کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ چنانچہ اس سورہ میں بھی ایک طرف توحید کے دلائل کی طرف مختصر اشارے کیے گئے ہیں، اور دوسری طرف قصۂ آدم و ابلیس سنا کر نصیحت فرمائی گئی ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمان اور رحیم ہے

ا۔ل۔ر۔ یہ آیات ہیں کتابِ الٰہی اور قرآنِ مُبین کی۔[1]

بعید نہیں کہ ایک وقت وہ آ جائے جب وہی لوگ جنہوں نے آج (دعوتِ اسلام کو قبول کرنے سے) انکار کر دیا ہے پچھتا پچھتا کر کہیں گے کہ کاش ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہوتا۔ چھوڑو انہیں۔ کھائیں پئیں، مزے کریں، اور بھلاوے میں ڈالے رکھے ان کو جھوٹی امید۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ ہم نے اس سے پہلے جس بستی کو بھی ہلاک کیا ہے اس کے لئے ایک خاص مہلتِ عمل لکھی جا چکی تھی۔[2] کوئی قوم نہ اپنے وقتِ مقرر سے پہلے ہلاک ہو سکتی ہے، نہ اس کے بعد چھوٹ سکتی ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں "اے وہ شخص جس پر ذکر[3] نازل ہوا ہے[4]، تو یقیناً دیوانہ ہے۔ اگر تو سچا ہے تو ہمارے

---

[1] یہ اس سورہ کی مختصر تعارفی تمہید ہے جس کے بعد فوراً ہی اصل موضوع پر خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن کے لئے "مبین" کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات اس قرآن کی ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف ظاہر کرتا ہے۔

[2] مطلب یہ ہے کہ کفر کرتے ہی فوراً تو ہم نے کبھی کسی قوم کو بھی نہیں پکڑ لیا ہے، پھر یہ نادان لوگ کیوں اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ نبی کے ساتھ تکذیب و استہزاء کی جو روش انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اس پر چونکہ ابھی تک انہیں سزا نہیں دی گئی، اس لئے یہ نبی سرے سے نبی ہی نہیں ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہم ہر قوم کے لئے پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ اس کو سننے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لئے اتنی مہلت دی جائے گی، اور اس حد تک اس کی شرارتوں اور خباثتوں کے باوجود پورے تحمل کے ساتھ اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع دیا جاتا رہے گا۔ یہ مہلت جب تک باقی رہتی ہے، اور ہماری مقرر کی ہوئی حد جس وقت تک آ نہیں جاتی، ہم ڈھیل دیتے رہتے ہیں۔

[3] "ذکر" کا لفظ قرآن میں اصطلاحاً کلامِ الٰہی کے لئے استعمال ہوا ہے جو سراسر نصیحت بن کے آتا ہے پہلے جتنی کتابیں انبیاء پر نازل ہوئی تھیں وہ سب بھی "ذکر" تھیں اور یہ قرآن بھی "ذکر" ہے۔ ذکر کے اصل معنی ہیں یاد دلانا، "ہوشیار کرنا" اور "نصیحت کرنا"۔

[4] یہ فقرہ وہ لوگ طنز کے طور پر کہتے تھے۔ ان کو تو یہ تسلیم ہی نہیں تھا کہ یہ ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم (باقی ص ۴۵ پر)

سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتا؟ — ہم فرشتوں کو یوں نہیں اتارا کرتے۔ وہ جب اترتے ہیں تو حق کے ساتھ اترتے ہیں، اور پھر لوگوں کو مہلت نہیں دی جاتی۔[4] رہا یہ ذکر، تو اس کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے نگہبان ہیں۔[5]

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) پر نازل ہوا ہے۔ نہ اسے تسلیم کر لینے کے بعد وہ آپ کو دیوانہ کہہ سکتے تھے۔ دراصل ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ "اے وہ شخص جس کا دعویٰ یہ ہے کہ مجھ پر ذکر نازل ہوا ہے"۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت سننے کے بعد اپنے درباریوں سے کہی تھی کہ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ "یہ پیغمبر صاحب جو تم لوگوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، ان کا دماغ درست نہیں ہے"۔

[4] یعنی فرشتے محض تماشا دکھانے کے لیے نہیں اترا کرتے کہ جب کسی قوم نے کہا بلاؤ فرشتوں کو اور وہ فوراً آحاضر ہوئے۔ نہ فرشتے اس غرض کے لیے کبھی بھیجے جاتے ہیں کہ وہ آکر لوگوں کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کریں اور پردۂ غیب کو چاک کر کے وہ سب کچھ دکھا دیں جس پر ایمان لانے کی دعوت انبیاء علیہم السلام نے دی ہے۔ فرشتوں کو بھیجنے کا وقت تو وہ آخری وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کا فیصلہ چکا دینے کا ارادہ کر لیا جاتا ہے۔ اس وقت بس فیصلہ چکا دیا جاتا ہے، یہ نہیں کہا جاتا کہ اب ایمان لاؤ تو چھوڑے دیتے ہیں۔ ایمان لانے کی جتنی مہلت بھی ہے اسی وقت تک ہے جب تک کہ حقیقت بے نقاب نہیں ہو جاتی۔ اس کے بے نقاب ہو جانے کے بعد ایمان لانے کا کیا سوال۔

"حق کے ساتھ اترتے ہیں" کا مطلب "حق لے کر اترنا" ہے، یعنی وہ اس لیے آتے ہیں کہ باطل کو مٹا کر حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ لے کر آتے ہیں اور اسے نافذ کر کے چھوڑتے ہیں۔

[5] یعنی یہ "ذکر" جس کے لانے والے کو تم مجنون کہہ رہے ہو، یہ ہمارا نازل کیا ہوا ہے، اس نے خود نہیں گھڑا ہے۔ اس لیے یہ گالی اس کو نہیں ہم کو دی گئی ہے۔ اور یہ خیال تم اپنے دل سے نکال دو کہ تم اس کا کچھ بگاڑ سکو گے۔ یہ براہ راست ہماری حفاظت میں ہے۔ نہ تمہارے مٹائے مٹ سکے گا، نہ تمہارے دبائے دب سکے گا، نہ تمہارے طعنوں اور اعتراضوں سے اس کی قدر گھٹ سکے گی، نہ تمہارے روکے اس کی دعوت رک سکے گی، نہ اس میں تحریف اور ردوبدل کرنے کا کبھی کسی کو موقع مل سکے گا۔

اے نبی، ہم تم سے پہلے بہت سی گزری ہوئی قوموں میں رسول بھیج چکے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے پاس کوئی رسول آیا ہو اور انہوں نے اس کا مذاق نہ اڑایا ہو۔ مجرمین کے دلوں میں تو ہم اس ذکر کو اسی طرح (سلاخ کے مانند) گزارتے ہیں۔ وہ اس پر ایمان نہیں لایا کرتے۔[۱] قدیم سے اس قماش کے لوگوں کا یہی طریقہ چلا آ رہا ہے۔ اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ بھی کھول دیتے اور وہ دن دہاڑے اس میں چڑھنے بھی لگتے
تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے، بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔ ع ۱
یہ ہماری کارفرمائی ہے کہ آسمان میں ہم نے بہت سے مضبوط قلعے[۲] بنائے، ان کو دیکھنے والوں کیلئے

---

۱ عام طور پر مترجمین و مفسرین نے نَسْلُکُہٗ کی ضمیر استہزاء کی طرف، اور لَا یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ کی ضمیر ذکر کی طرف پھیری ہے، اور مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "ہم اسی طرح اس استہزاء کو مجرمین کے دلوں میں داخل کرتے ہیں، اور وہ اس ذکر پر ایمان نہیں لاتے"۔ اگرچہ نحوی قاعدے کے لحاظ سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، لیکن ہمارے نزدیک نحو کے اعتبار سے بھی اور نظم کلام کے لحاظ سے بھی زیادہ صحیح یہ ہے کہ دونوں ضمیریں ذکر کی طرف پھیری جائیں۔ سلک کے معنی عربی زبان میں کسی چیز کو دوسری چیز میں چلانے، گزارنے اور پرونے کے ہیں، جیسے تاگے کو سوئی کے ناکے میں گزارنا۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کے اندر تو یہ ذکر قلب کی ٹھنڈک اور روح کی غذا بن کر اترتا ہے، مگر مجرموں کے دلوں میں یہ شتابہ بن کر لگتا ہے اور ان کے اندر اسے سن کر ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے گویا کہ ایک گرم سلاخ تھی جو سینے کے پار ہو گئی۔

۲ بُرج عربی زبان میں قلعے، قصر اور مستحکم عمارت کو کہتے ہیں۔ قدیم علم ہیئت میں "بُرج" کا لفظ اصطلاحاً ان بارہ منزلوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن پر سورج کے مدار کو تقسیم کیا گیا تھا۔ اس وجہ سے بعض مفسرین نے یہ سمجھا کہ قرآن کا اشارہ انہی بروج کی طرف ہے۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس سے مراد سیارے لیے ہیں۔ لیکن بعد کے مضمون پر غور کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد عالم بالا کے وہ خطے ہیں جن میں سے ہر خطے کو نہایت مستحکم سرحدوں نے دوسرے خطے سے جدا کر رکھا ہے۔ اگرچہ یہ سرحدیں فضائے بسیط میں غیر مرئی طور پر کھنچی ہوئی ہیں، لیکن ان کو پار کر کے کسی چیز کا ایک خطے سے دوسرے خطے میں چلا جانا سخت مشکل ہے۔ اس مفہوم کے لحاظ سے ہم بروج کو محفوظ خطوں (Fortified Spheres) کے معنی میں لینا زیادہ صحیح سمجھتے ہیں۔

مزین کیا،[۱] اور ہر شیطان مردود سے ان کو محفوظ کر دیا۔[۲] کوئی شیطان ان میں راہ نہیں پا سکتا، الا یہ کہ کچھ سن گن لے لے۔[۳] اور جب وہ سن گن لینے کی کوشش کرتا ہے تو ایک شعلۂ روشن اس کا پیچھا کرتا ہے۔[۴]

---

۱ یعنی ہر خطے میں کوئی نہ کوئی روشن سیارہ یا تارا رکھ دیا اور اس طرح سارا عالم جگمگا اٹھا۔ با الفاظ دیگر ہم نے اس ناپیدا کنار کائنات کو ایک بھیانک ڈھنڈار بنا کر نہیں رکھ دیا بلکہ ایک ایسی حسین و جمیل دنیا بنائی جس میں ہر طرف نگاہوں کو جذب کر لینے والے جلوے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کاریگری میں صرف ایک صانع اکبر کی صنعت اور ایک حکیم اجل کی حکمت ہی نظر نہیں آتی ہے، بلکہ ایک کمال درجے کا پاکیزہ ذوق رکھنے والے آرٹسٹ کا آرٹ بھی نمایاں ہے۔ یہی مضمون ایک دوسرے مقام پر یوں بیان کیا گیا ہے، اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ-۱) "وہ خدا کہ جس نے ہر چیز جو بنائی خوب ہی بنائی"۔

۲ یعنی جس طرح زمین کی دوسری مخلوقات زمین کے خطے میں مقید ہیں اسی طرح شیاطین جن بھی اسی خطے میں مقید ہیں، عالم بالا تک ان کی رسائی نہیں ہے۔ اس سے دراصل لوگوں کی اس عام غلط فہمی کو دور کرنا مقصود ہے جس میں پہلے بھی عوام الناس مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان اور اس کی ذریت کے لیے ساری کائنات کھلی پڑی ہے، جہاں تک وہ چاہیں پرواز کر سکتے ہیں۔ قرآن اس کے جواب میں بتاتا ہے کہ شیاطین ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے، انھیں غیر محدود پرواز کی طاقت ہرگز نہیں دی گئی ہے۔

۳ یعنی وہ شیاطین جو اپنے اولیا کو غیب کی خبریں لا کر دینے کی کوشش کرتے ہیں، جن کی مدد سے بہت سے کاہن، جوگی، عامل اور فقیر نما بہروپیے غیب دانی کا ڈھونگ رچایا کرتے ہیں۔ ان کے پاس حقیقت میں غیب دانی کے ذرائع بالکل نہیں ہیں۔ وہ کچھ سن گن لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں، کیونکہ ان کی ساخت انسانوں کی بہ نسبت فرشتوں کی ساخت سے کچھ قریب تر ہے، لیکن فی الواقع ان کے پلے کچھ پڑتا نہیں ہے۔

۴ "شہابِ مبین" کے لغوی معنی "شعلۂ روشن" کے ہیں۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں اس کے لیے "شہابِ ثاقب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی "تاریکی کو چھیدنے والا شعلہ"۔ اس سے مراد ضروری نہیں کہ وہ ٹوٹنے والا تارا ہی ہو جسے ہماری زبان میں اصطلاحاً شہابِ ثاقب کہا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اور کسی قسم کی شعاعیں ہوں، مثلاً کائناتی شعاعیں (Cosmic Rays) یا ان سے بھی زیادہ شدید کوئی اور قسم جو ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو۔ (باقی ص۔۔ پر)

ہم نے زمین کو پھیلایا، اس میں پہاڑ جمائے، اُس میں ہر نوع کی نباتات ٹھیک ٹھیک نپی تلی مقدار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۶) اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب ثاقب مراد ہوں جنہیں کبھی کبھی ہماری آنکھیں زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھتی ہیں۔ زمانہ حال کے مشاہدات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دُوربین سے دکھائی دینے والے شہاب ثاقب جو فضائے بسیط سے زمین کی طرف آتے نظر آتے ہیں، ان کی تعداد کا اوسط ۱ کھرب روزانہ ہے جن میں سے دو کروڑ کے قریب ہر روز زمین کے بالائی خطے میں داخل ہوتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچتا ہے۔ ان کی رفتار بالائی فضا میں کم و بیش ۲۶ میل فی سکنڈ ہوتی ہے اور بسا اوقات ۵۰ میل فی سکنڈ تک دیکھی گئی ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ برہنہ آنکھوں نے بھی ٹوٹنے والے تاروں کی غیر معمولی بارش دیکھی ہے۔ چنانچہ یہ چیز ریکارڈ پر موجود ہے کہ ۱۳ نومبر ۱۸۳۳ء کو شمالی امریکہ کے مشرقی علاقے میں صرف ایک مقام پر نصف شب سے لیکر صبح تک ۲ لاکھ شہاب ثاقب گرتے ہوئے دیکھے گئے (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا بحث ۱۹۴۶ء۔ جلد ۱۵، ص ۳۹-۳۳۷)۔ ہو سکتا ہے کہ یہی بارش عالم بالا کی طرف شیاطین کی پرواز میں مانع ہوتی ہو، کیونکہ زمین کے بالائی حدود سے گزر کر فضائے بسیط میں ۱ کھرب روزانہ کے اوسط سے ٹوٹنے والے تاروں کی برسات ان کے لئے اس فضا کو بالکل ناقابل عبور بنا دیتی ہوگی۔

اس سے کچھ ان "محفوظ قلعوں" کی نوعیت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ بظاہر فضا بالکل صاف شفاف ہے جس میں کہیں کوئی دیوار یا چھت بنی نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی فضا میں مختلف خطوں کو کچھ ایسی غیر مرئی فصیلوں سے گھیر رکھا ہے جو ایک خطے کو دُوسرے خطوں کی آفات سے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ انہی فصیلوں کی برکت ہے کہ جو شہاب ثاقب دس کھرب روزانہ کے اوسط سے زمین کی طرف گرتے ہیں وہ سب جل کر بھسم ہو جاتے ہیں اور بمشکل ایک زمین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے۔ دنیا میں شہابی پتھروں (Meteorites) کے جو نمونے پائے جاتے ہیں اور دنیا کے عجائب خانوں میں موجود ہیں ان میں سب سے بڑا ۶۴۵ پونڈ کا ایک پتھر ہے جو گر کر ۱۱ فیٹ زمین میں دھنس گیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک مقام پر ۳۶½ ٹن کا ایک آہنی تودہ پایا گیا ہے جس کے وہاں موجود ہونے کی کوئی توجیہ سائنس دان اس کے سوا نہیں کر سکے ہیں کہ یہ بھی آسمان سے گرا ہوا ہے۔ تصور کیجئے کہ اگر زمین کی بالائی سرحدوں کو مضبوط حصاروں سے محفوظ نہ کر دیا گیا ہوتا تو ان ٹوٹنے والے تاروں کی بارش زمین کا کیا حال کر دیتی۔ یہی حصار ہیں جن کو قرآن مجید نے "بروج" (محفوظ قلعوں) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

کے ساتھ اگائی، اور اس میں معیشت کے اسباب فراہم کئے، تمہارے لئے بھی اور اُن بہت سی مخلوقات کے لئے بھی جن کے رازق تم نہیں ہو۔
کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقرر مقدار میں نازل کرتے ہیں[۲]۔

---

[۱] اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے ایک اور اہم نشان کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ نباتات کی ہر نوع میں تناسل کی اس قدر زبردست طاقت ہے کہ اگر اس کے صرف ایک پودے ہی کی نسل کو زمین میں بڑھنے کا موقع مل جاتا تو چند سال کے اندر روئے زمین پر بس وہی وہ نظر آتی، کسی دوسری قسم کی نباتات کے لئے کوئی جگہ نہ رہتی۔ مگر یہ ایک حکیم اور قادرِ مطلق کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کے مطابق بے حد و حساب اقسام کی نباتات اس زمین پر اگ رہی ہیں اور ہر نوع کی پیداوار اپنی ایک مخصوص حد پر پہنچ کر رک جاتی ہے۔ اسی منظر کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہر نوع کی جسامت، پھیلاؤ، اُٹھان اور نشو و نما کی ایک حد مقرر ہے جس سے نباتات کی کوئی قسم بھی تجاوز نہیں کر سکتی۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ہر درخت، ہر پودے اور ہر بیل بوٹے کے لئے جسم، قد، شکل، برگ، و بار اور پیداوار کی ایک مقدار پورے ناپ تول اور حساب و شمار کے ساتھ مقرر کر رکھی ہے۔

[۲] یہاں اِس حقیقت پر متنبہ فرمایا کہ یہ معاملہ صرف نباتات ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ تمام موجودات کے معاملہ میں عام ہے۔ ہوا، پانی، روشنی، گرمی، سردی، جمادات، نباتات، حیوانات، غرض ہر چیز، ہر نوع، ہر جنس اور ہر قوت و طاقت کے لئے ایک حد مقرر ہے جس پر وہ ٹھیری ہوئی ہے اور ایک مقدار مقرر ہے جس سے نہ وہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے۔ اسی تقدیر اور کمال درجہ کی حکیمانہ تقدیر ہی کا یہ کرشمہ ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک پورے نظامِ کائنات میں یہ توازن، یہ اعتدال، اور یہ تناسب نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ ہوتی، یا بہت سے خداؤں کی کاریگری و کارفرمائی کا نتیجہ ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ بے شمار مختلف اشیاء اور قوتوں کے درمیان ایسا مکمل توازن و تناسب قائم ہوتا اور مسلسل قائم رہ سکتا؟

بار آور ہواؤں کو ہم ہی بھیجتے ہیں، پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں، اور اُس پانی سے تمہیں سیراب کرتے ہیں۔ اِس دولت کے خزانہ دار تم نہیں ہو۔

زندگی اور موت ہم دیتے ہیں، اور ہم ہی سب کے وارث ہونے والے ہیں[1]۔ پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان کو بھی ہم نے دیکھ رکھا ہے، اور بعد کے آنے والے بھی ہماری نگاہ میں ہیں۔ یقیناً تمہارا رب ان سب کو اکٹھا کرے گا، وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی[2]۔ ع ۲

ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے بنایا[3]۔ اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم لُو کی لپٹ

۱؎ یعنی تمہارے بعد ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ تمہیں جو کچھ بھی ملا ہوا ہے محض عارضی استعمال کیلئے ملا ہوا ہے۔ آخرکار تمہاری دنیا کی ہر چیز کو یونہی چھوڑ کر تم خالی ہاتھ رخصت ہو جاؤ گے اور یہ سب چیزیں پھر جوں کی توں ہمارے خزانے میں رہ جائیں گی۔

۲؎ یعنی اُس کی حکمت یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ سب کو اکٹھا کرے۔ اور اس کا علم سب پر اس طرح حاوی ہے کہ کوئی متنفس اُس سے چھوٹ نہیں سکتا، بلکہ کسی اگلے پچھلے انسان کی خاک کا کوئی ذرہ بھی اُس سے گم نہیں ہو سکتا۔ اسلئے جو شخص حیاتِ اُخروی کو مستبعد سمجھتا ہے وہ خدا کی صفتِ حکمت سے بیخبر ہے، اور جو شخص حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ "جب مرنے کے بعد ہماری خاک کا ذرہ ذرہ منتشر ہو جائیگا تو ہم کیسے دوبارہ پیدا کئے جائیں گے" وہ خدا کی صفتِ علم کو نہیں جانتا۔

۳؎ یہاں قرآن اس امر کی صاف تصریح کرتا ہے کہ انسان حیوانی منازل سے ترقی کرتا ہوا بشریت کے حدود میں نہیں آیا ہے، جیسا کہ نئے دور کے ڈاروینیت سے متاثر مفسرینِ قرآن ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تخلیق کی ابتدا براہِ راست ارضی مادوں سے ہوئی ہے جن کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ نے صلصال من حمإ مسنون کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ حَمَأ عربی زبان میں ایسی سیاہ کیچڑ کو کہتے ہیں جس کے اندر بُو پیدا ہو چکی ہو، یا با الفاظ دیگر خمیر اٹھ آیا ہو۔ مسنون کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی ہیں متغیّر، مُنتِن اور اَملس، یعنی ایسی سڑی ہوئی جس میں سڑنے کی وجہ سے چکنائی پیدا ہو گئی ہو۔ دوسرے معنی ہیں مصوّر اور مصبوب، یعنی قالب میں ڈھلی ہوئی جس کو ایک خاص صورت دے دی گئی ہو۔ صلصال اس سوکھے گارے کو کہتے ہیں جو خشک ہو جانے کے بعد بجنے لگے۔ یہ الفاظ صاف ظاہر کرتے ہیں کہ خمیر اٹھی ہوئی مٹی کا ایک پتلا بنایا گیا تھا جو بننے کے بعد خشک ہوا اور پھر اس کے اندر رُوح پھونکی گئی۔

سے پیدا کر چکے تھے[1]۔ پھر یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ "میں سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں۔ جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں[2]

۱؎ سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں اور نار کو سموم کی طرف نسبت دینے کی صورت میں اس کے معنی آگ کے بجائے تیز حرارت کے ہو جاتے ہیں۔ اس سے ان مقامات کی تشریح ہو جاتی ہے جہاں قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جن آگ سے پیدا کیے گئے ہیں۔

۲؎ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اندر جو روح پھونکی گئی ہے وہ دراصل صفاتِ الٰہی کا ایک عکس یا پرتو ہے۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، اختیار، اور دوسری جتنی صفات انسان میں پائی جاتی ہیں جن کے مجموعہ ہی کا نام روح ہے، یہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی صفات کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو اس کالبدِ خاکی پر ڈالا گیا ہے، اور اسی پرتو کی وجہ سے انسان زمین پر خدا کا خلیفہ اور ملائکہ سمیت تمام موجوداتِ ارضی کا مسجود قرار پایا ہے۔

یوں تو ہر وہ صفت جو مخلوقات میں پائی جاتی ہے، اس کا مصدر و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی کوئی نہ کوئی صفت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جَعَلَ اللّٰہُ الرَّحْمَۃَ مِائَۃَ جُزْءٍ فَاَمْسَکَ عِنْدَہٗ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ وَاَنْزَلَ فِی الْاَرْضِ جُزْءًا وَّاحِدًا فَمِنْ ذٰلِکَ الْجُزْءِ یَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰی تَرْفَعَ الدَّابَّۃُ حَافِرَھَا عَنْ وَلَدِھَا خَشْیَۃَ اَنْ تُصِیْبَہٗ (بخاری و مسلم)۔ "اللہ تعالیٰ نے رحمت کو سو حصوں میں تقسیم فرمایا، پھر ان میں سے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور صرف ایک حصہ زمین میں اتارا۔ یہ اسی ایک حصے کی برکت ہے جس کی وجہ سے مخلوقات آپس میں ایک دوسرے پر رحم کرتی ہیں، یہاں تک کہ اگر ایک جانور اپنے بچے پر سے اپنا کھر اٹھاتا ہے تاکہ اسے ضرر نہ پہنچ جائے، تو یہ بھی دراصل اسی حصۂ رحمت کا اثر ہے"۔ مگر جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر فضیلت دیتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جامعیت کے ساتھ اللہ کی صفات کا پرتو اس پر ڈالا گیا ہے اس سے کوئی دوسری مخلوق سرفراز نہیں کی گئی۔

یہ ایک ایسا باریک مضمون ہے جس کے سمجھنے میں ذرا سی غلطی بھی آدمی کر جائے تو اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ صفاتِ الٰہی میں سے ایک حصہ پانا الوہیت کا کوئی جز پا لینے کا ہم معنی ہے۔ حالانکہ الوہیت اس سے وراء الوریٰ ہے کہ کوئی مخلوق اس کا ایک ادنیٰ شائبہ بھی پا سکے۔

تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا" چنانچہ تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔[۱] رب نے پوچھا "اے ابلیس! تجھے کیا ہوا کہ تو نے سجدہ کرنے والوں کا ساتھ نہ دیا؟" اس نے کہا "میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں اس بشر کو سجدہ کروں جسے تو نے سڑی ہوئی مٹی کے سوکھے گارے سے پیدا کیا ہے۔" رب نے فرمایا "اچھا تو نکل جا یہاں سے کیونکہ تو مردود ہے، اور اب روزِ جزا تک تجھ پر لعنت ہے۔"[۲] اس نے عرض کیا "میرے رب یہ بات ہے تو پھر مجھے اُس روز تک کے لئے مہلت دے جبکہ سب انسان دوبارہ اُٹھائے جائیں گے۔" فرمایا "اچھا، تجھے مہلت ہے اس دن تک جس کا وقت ہمیں معلوم ہے۔" وہ بولا "میرے رب، جیسا تو نے مجھے بہکایا اسی طرح اب میں زمین میں اِن کے لئے دلفریبیاں پیدا کر کے اِن سب کو بہکا دوں گا[۳] سوائے تیرے اُن بندوں کے جنہیں تُو نے اِن میں سے خالص کر لیا ہو۔" فرمایا "یہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔[۴]

۱؎ تقابل کے لئے سورۂ بقرہ رکوع ۴، سورۂ نساء رکوع ۱۸، اور سورۂ اعراف رکوع ۲ پیشِ نظر رہے نیز ہمارے اُن حواشی پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے جو اِن مقامات پر لکھے گئے ہیں۔

۲؎ یعنی قیامت تک تو ملعون رہے گا، اس کے بعد جب روزِ جزا قائم ہوگا تو پھر تجھے تیری نافرمانیوں کی سزا دی جائے گی۔

۳؎ یعنی جس طرح تُو نے اِس حقیر اور کمتر مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم دے کر مجھے مجبور کر دیا کہ تیرا حکم نہ مانوں، اسی طرح اب میں اِن انسانوں کے لئے دنیا کو ایسا دلفریب بنا دُوں گا کہ وہ سب اس سے دھوکا کھا کر تیرے نافرمان بن جائیں گے۔ بالفاظِ دیگر ابلیس کا مطلب یہ تھا کہ میں زمین کی زندگی اور اس کی لذتوں اور اس کے عارضی فوائد و منافع کو انسان کے لئے ایسا خوشنما بنا دوں گا کہ وہ خلافت اور اس کی ذمہ داریوں اور آخرت کی باز پرس کو بھول جائیں گے اور خود تجھے بھی یا تو فراموش کر دیں گے یا تجھے یاد رکھنے کے باوجود تیرے احکام کی خلاف ورزیاں کریں گے۔

۴؎ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی وہ ہیں جو ہم نے ترجمہ میں بیان کئے ہیں۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ هٰذَا طَرِيقٌ حَقٌّ عَلَيَّ أَنْ أُرَاعِيَهُ، یعنی یہ بات درست ہے، میں بھی اس کا پابند رہوں گا۔

بے شک، جو میرے حقیقی بندے ہیں ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف اُن بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں۔[۱] اور اُن سب کے لئے جہنم کی وعید ہے۔[۲]

[۱] اس فقرے کے بھی دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ترجمے میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ میرے بندوں (یعنی عام انسانوں) پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہوگا کہ تو انہیں زبردستی نافرمان بنا دے۔ البتہ جو خود ہی بہکے ہوئے ہوں اور آپ ہی تیری پیروی کرنا چاہیں انہیں تیری راہ پر جانے کے لئے چھوڑ دیا جائے گا، انہیں ہم زبردستی اس سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں گے۔

پہلے معنی کے لحاظ سے مضمون کا خلاصہ یہ ہوگا کہ بندگی کا طریقہ اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، جو لوگ اس راستے کو اختیار کریں گے ان پر شیطان کا بس نہ چلیگا، انہیں اللہ اپنے لئے خالص فرما لیگا اور شیطان خود بھی اقراری ہے کہ وہ اس کے پھندے میں نہ پھنسیں گے۔ البتہ جو لوگ خود بندگی سے منحرف ہو کر اپنی فلاح وسعادت کی راہ گم کر دیں گے وہ ابلیس کے ہتھے چڑھ جائیں گے اور پھر جدھر جدھر وہ انہیں فریب دیکر لے جانا چاہے گا، وہ اس کے پیچھے بھٹکتے اور دُور سے دُور تر نکلتے چلے جائیں گے۔

دوسرے معنی کے لحاظ سے اس بیان کا خلاصہ یہ ہوگا: شیطان نے انسانوں کو بہکانے کے لئے اپنا طریق کار یہ بیان کیا کہ وہ زمین کی زندگی کو ان کیلئے خوشنما بنا کر انہیں خدا سے غافل اور بندگی کی راہ سے منحرف کریگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی توثیق کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ شرط میں نے مانی، اور مزید توضیح کرتے ہوئے یہ بات بھی صاف کر دی کہ تجھے صرف فریب دینے کا اختیار دیا جا رہا ہے، یہ اقتدار نہیں دیا جا رہا کہ تو ہاتھ پکڑ کر انہیں زبردستی اپنی راہ پر کھینچ لے جائے۔ شیطان نے اپنے نوٹس سے اُن بندوں کو مستثنیٰ کیا جنہیں اللہ اپنے لئے خالص فرما لے۔ اس سے یہ غلط فہمی مترشح ہو رہی تھی کہ شاید اللہ تعالیٰ بغیر کسی معقول وجہ کے یونہی جس کو چاہے گا خالص کر لیگا اور وہ شیطان کی دست رس سے بچ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر بات صاف کر دی کہ جو خود بہکا ہوا ہوگا وہ تیری پیروی کرے گا۔ بالفاظِ دیگر جو بہکا ہوا نہ ہوگا وہ تیری پیروی نہ کریگا اور وہی ہمارا وہ مخصوص بندہ ہوگا جسے ہم خالص اپنا کر لیں گے۔

[۲] اس جگہ یہ قصہ جس غرض کے لئے بیان کیا گیا ہے اسے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاق وسباق کو واضح طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ پہلے اور دوسرے رکوع کے مضمون پر غور کرنے سے یہ بات صاف سمجھ میں (باقی ص ۶۳ پر)

یہ جہنم (جس کی وعید پیروان ابلیس کے لئے کی گئی ہے) اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے۔[1] بخلاف اس کے متقی لوگ[2] باغوں اور چشموں میں ہونگے اور ان سے کہا جائے گا کہ داخل ہو جاؤ ان میں سلامتی کے ساتھ بے خوف و خطر۔ ان کے دلوں میں جو

(بقیہ حاشیہ صفحہ) آجاتی ہے کہ اس سلسلہ بیان میں آدم و ابلیس کا یہ قصہ بیان کرنے سے مقصود کفار کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا ہے کہ تم اپنے ازلی دشمن شیطان کے پھندے میں پھنس گئے ہو اور اُس پستی میں گرے چلے جا رہے ہو جس میں وہ اپنے حسد کی بنا پر تمہیں گرانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس یہ نبی تمہیں اُس کے پھندے سے نکال کر اس بلندی کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے جو دراصل انسان ہونے کی حیثیت سے تمہارا فطری مقام ہے لیکن تم عجیب احمق لوگ ہو کہ اپنے دشمن کو دوست، اور اپنے خیر خواہ کو دشمن سمجھ رہے ہو۔ اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اسی قصے سے اُن پر واضح کی گئی ہے کہ تمہارے لئے راہ نجات صرف ایک ہے، اور وہ اللہ کی بندگی ہے۔ اس راہ کو چھوڑ کر تم جس راہ پر بھی جاؤ گے وہ شیطان کی راہ ہے جو سیدھی جہنم کی طرف جاتی ہے۔ تیسری بات جو اس قصے کے ذریعہ سے ان کو سمجھائی گئی ہے، یہ ہے کہ اپنی اس غلطی کے ذمہ دار تم خود ہو۔ شیطان کا کوئی کام اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وہ ظاہرِ حیات دنیا سے تم کو دھوکا دے کر تمہیں بندگی کی راہ سے منحرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس سے دھوکا کھانا تمہارا اپنا فعل ہے جس کی کوئی ذمہ داری تمہارے اپنے سوا کسی اور پر نہیں ہے۔ (اس کی مزید توضیح کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ ابراہیم۔ رکوع ۴)

[1] جہنم کے یہ دروازے اُن گمراہیوں اور معصیتوں کے لحاظ سے ہیں جن پر چل کر آدمی اپنے لئے دوزخ کی راہ کھولتا ہے۔ مثلاً کوئی دہریت کے راستے سے دوزخ کی طرف جاتا ہے، کوئی شرک کے راستے سے، کوئی نفاق کے راستے سے، کوئی نفس پرستی اور فسق و فجور کے راستے سے، کوئی ظلم و ستم اور خلق آزاری کے راستے سے، کوئی تبلیغ ضلالت اور اقامت کفر کے راستے سے، اور کوئی اشاعت فحشاء و منکر کے راستے سے۔

[2] یعنی وہ لوگ جو شیطان کی پیروی سے بچے رہے ہوں اور جنہوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے عبدیت کی زندگی بسر کی ہو۔

تھوڑی بہت کھوٹ کپٹ ہوگی اسے ہم نکال دیں گے،[1] وہ آپس میں بھائی بھائی بن کر آمنے سامنے تختوں پر بیٹھیں گے۔ انہیں نہ وہاں کسی مشقت سے پالا پڑیگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔[2]

اے نبی! میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں۔ مگر اس کے ساتھ میرا عذاب بھی نہایت دردناک عذاب ہے۔

اور انہیں ذرا ابراہیمؑ کے مہمانوں کا قصہ سناؤ۔[3] جب وہ آئے اس کے ہاں اور کہا "سلام ہو تم پر"

---

[1] یعنی نیک لوگوں کے درمیان آپس کی غلط فہمیوں کی بنا پر دنیا میں اگر کچھ کدورتیں پیدا ہوگئی ہونگی تو جنت میں داخل ہونے کے وقت وہ دور ہوجائیں گی اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے بالکل صاف کر دیئے جائیں گے۔ یہی مضمون سورۂ اعراف رکوع ۵ میں بھی گزر چکا ہے۔ اسی آیت کا حوالہ دے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت طلحہ کے صاحبزادے عمران سے فرمایا تھا کہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے باپ کے درمیان صفائی کرا دے گا۔

[2] اِس کی تشریح اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں حضورؐ نے خبر دی ہے کہ یُقال لاھل الجنۃ ان لکم ان تصحوا فلا تمرضوا ابداً، وان لکم ان تعیشوا فلا تموتوا ابداً وان لکم ان تشبوا ولا تھرموا ابداً، وان لکم ان تقیموا فلا تظعنوا ابداً۔ یعنی اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ اب تم ہمیشہ تندرست رہوگے، کبھی بیمار نہ پڑوگے۔ اور اب تم ہمیشہ زندہ رہوگے، کبھی موت تم کو نہ آئے گی۔ اور اب تم ہمیشہ جوان رہوگے، کبھی بڑھاپا تم پر نہ آئے گا، اور اب تم ہمیشہ مقیم رہوگے، کبھی کوچ کرنے کی تمہیں ضرورت نہ ہوگی۔ اس کی مزید تشریح اُن آیات و احادیث سے ہوتی ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جنت میں انسان کو اپنی معاش اور اپنی ضروریات کی فراہمی کے لئے کوئی محنت نہ کرنی پڑے گی، سب کچھ اسے بلاسعی و مشقت ملیگا۔

[3] یہاں حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بعد متصلاً قوم لوطؑ کا قصہ جس غرض کے لئے سنایا جا رہا ہے اس کو سمجھنے کے لئے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ سورہ کے آغاز میں کفارِ مکہ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ "اگر تم سچے نبی ہو تو ہمارے سامنے فرشتوں کو لے کیوں نہیں آتے؟" اس کا مختصر جواب وہاں صرف اس قدر دے کر چھوڑ دیا گیا تھا کہ "فرشتوں کو ہم یونہی نہیں اتار دیا کرتے، (باقی صفحہ ۶۶ پر)

تو اس نے کہا "ہمیں تم سے ڈر لگتا ہے"[۱]۔ انہوں نے جواب دیا "ڈرو نہیں، ہم تمہیں ایک بڑے سیانے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں"[۲]۔ ابراہیم نے کہا "کیا تم اس بڑھاپے میں مجھے اولاد کی بشارت دیتے ہو؟ ذرا سوچو تو سہی کہ یہ کیسی بشارت تم مجھے دے رہے ہو؟" انہوں نے جواب دیا "ہم تمہیں برحق بشارت دے رہے ہیں، تم مایوس نہ ہو"۔ ابراہیم نے کہا "اپنے رب کی رحمت سے مایوس تو گمراہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں"۔ پھر ابراہیم نے پوچھا "اے فرستادگانِ الٰہی! وہ مہم کیا ہے جس پر آپ حضرات تشریف لائے ہیں؟" وہ بولے "ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں[۳]۔ صرف لوط کے گھر والے مستثنیٰ ہیں، ان کو ہم بچا لیں گے، سوائے اس کی بیوی کے جس کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے کہ وہ پیچھے رہ جائیگی"[۴]۔

پھر جب یہ فرستادے لوط کے ہاں پہنچے تو اس نے کہا "آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں"[۵]۔ انہوں

(بقیہ حاشیہ ۳۵) انہیں تو ہم جب بھیجتے ہیں حق کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں"۔ اب اس کا مفصل جواب یہاں ان دونوں قصوں کے پیرایہ میں دیا جا رہا ہے۔ یہاں انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ایک "حق" تو وہ ہے جسے لیکر فرشتے ابراہیم کے پاس آئے تھے، اور دوسرا حق وہ ہے جسے لیکر وہ قوم لوط پر پہنچے تھے۔ اب تم خود دیکھ لو کہ تمہارے پاس ان میں سے کونسا حق لیکر فرشتے آسکتے ہیں۔ ابراہیم والے حق کے لائق تو ظاہر ہے کہ تم نہیں ہو۔ اب کیا اس حق کے ساتھ فرشتوں کو بلوانا چاہتے ہو جسے لیکر وہ قوم لوط کے ہاں نازل ہوئے تھے؟

۱۔ تقابل کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ ہود، رکوع ۷ مع حواشی۔

۲۔ یعنی حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت۔

۳۔ اشارے کا یہ اختصار صاف بتا رہا ہے کہ قوم لوط کے جرائم کا پیمانہ اس وقت اتنا لبریز ہو چکا تھا کہ حضرت ابراہیم جیسے باخبر آدمی کے سامنے اس کا نام لینے کی قطعاً ضرورت نہ تھی، بس "ایک مجرم قوم" کہہ دینا بالکل کافی تھا۔

۴۔ تقابل کے لئے ملاحظہ ہو سورۂ اعراف، رکوع ۱۰، سورۂ ہود، رکوع ۷۔

۵۔ یہاں بات مختصر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ ہود میں اس کی تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ان لوگوں کے آنے سے حضرت لوط بہت گھبرائے اور سخت دل تنگ ہوئے اور ان کو دیکھتے ہی اپنے دل میں کہنے لگے کہ آج بڑا سخت وقت آیا ہے۔ اس گھبراہٹ کی وجہ قرآن کے بیان سے اشارۃً اور روایات سے صراحۃً معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ یہ فرشتے نہایت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط کے ہاں پہنچے تھے۔

نے جواب دیا "نہیں، بلکہ ہم وہی چیز لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں یہ لوگ شک کر رہے تھے۔ ہم تم سے سچ کہتے ہیں کہ ہم حق کے ساتھ تمہارے پاس آئے ہیں، لہٰذا اب تم کچھ رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو۱؎۔ تم میں سے کوئی پلٹ کر نہ دیکھے۲؎۔ بس سیدھے چلے جاؤ جدھر جانے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔" اور اسے ہم نے اپنا یہ فیصلہ پہنچا دیا کہ صبح ہوتے ہوتے ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بے تاب ہو کر لوط کے گھر چڑھ آئے۳؎۔ لوط نے کہا

۱؎ یعنی اس غرض سے اپنے گھر والوں کے پیچھے چلو کہ ان میں سے کوئی ٹھیرنے نہ پائے۔

۲؎ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر کے ہو جاؤ گے۔ جیسا کہ بائیبل میں بیان ہوا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشا دیکھنے کے لئے نہ ٹھیر جانا۔ یہ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے، اور نہ مجرم قوم کی ہلاکت پر آنسو بہانے کا۔ ایک لمحہ بھی اگر تم نے معذب قوم کے علاقے میں دم لے لیا تو بعید نہیں کہ تمہیں بھی اس ہلاکت کی بارش سے کچھ گزند پہنچ جائے۔

۳؎ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند خوبصورت مہمانوں کا آ جانا اس بات کے لئے کافی تھا کہ اس کے گھر پر اوباشوں کا ایک ہجوم امنڈ آئے اور علانیہ وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہمانوں کو بدکاری کے لئے ہمارے حوالے کر دے۔ ان کی پوری آبادی میں کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اٹھاتا اور نہ ان کی قوم میں کوئی اخلاقی حس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوط جیسے مقدس انسان اور معلم اخلاق کے گھر پر بھی جب بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا۔

تلمود میں اس قوم کے جو حالات لکھے ہیں، ان کا ایک خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جس سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستے میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھیرنا پڑا۔ اس کے ساتھ

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

”بھائیو! یہ میرے مہمان ہیں، میری فضیحت نہ کرو، اللہ سے ڈرو، مجھے رُسوا نہ کرو“۔ وہ بولے ”کیا ہم

(بقیہ حاشیہ ص ۶) اپنا زادِ راہ تھا۔ کسی سے اس نے میزبانی کی درخواست نہ کی بس ایک درخت کے نیچے اُتر گیا۔ مگر ایک سدومی اصرار کے ساتھ اٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا اس کے زین اور مال تجارت سمیت اڑا دیا۔ اس نے شور مچایا مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی، بلکہ بستی کے لوگوں نے اس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اسے نکال باہر کیا۔ ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوطؑ کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے اپنے غلام الیعزر کو سدوم بھیجا۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ الیعزر نے اُسے شرم دلائی کہ تم بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ مگر جواب میں سرِ بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا گیا۔ ایک مرتبہ ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا اور کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ وہ فاقے سے بدحال ہو کر ایک جگہ گرا پڑا تھا کہ حضرت لوطؑ کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اس کے لئے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لوطؑ اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی اور انہیں دھمکیاں دی گئیں کہ ان حرکتوں کے ساتھ تم لوگ ہماری بستی میں نہیں رہ سکتے۔ اس طرح کے متعدد واقعات بیان کرنے کے بعد تلمود کا مصنف لکھتا ہے کہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں یہ لوگ سخت ظالم، دھوکہ باز اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی غریب ان کی بستیوں سے روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کی لاش کے کپڑے اتار کر برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو بر سرِ عام لوٹ لئے جاتے اور ان کی فریاد کو ٹھٹھوں میں اڑا دیا جاتا۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جس کا سلسلہ میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس باغ میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاریاں کرتے تھے اور ایک لوطؑ کی زبان کے سوا کوئی زبان ان کو ٹوکنے والی نہ تھی۔ قرآن مجید میں اس پوری داستان کو سمیٹ کر صرف دو فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے کہ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ (وہ پہلے سے بہت برے برے کام کر رہے تھے) اور اَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنْكَرَ (تم مردوں سے خواہشِ نفس پوری کرتے ہو، مسافروں کی راہ مارتے ہو اور اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا بدکاریاں کرتے ہو؟)

بارہا تمہیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟" لوط نے عاجز ہو کر کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں[ل۱]!"

تیری جان کی قسم اے نبی! اُس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔

آخر کار پو پھٹتے ہی ان کو ایک زبردست دھماکے نے آلیا اور ہم نے اُس بستی کو تل پٹ کر کے رکھ دیا

[ل۱] اس کی تشریح سورۂ ہود کے حواشی میں بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ کلمات ایک شریف آدمی کی زبان پر ایسے وقت میں آئے ہیں جب کہ وہ بالکل تنگ آ چکا تھا اور بدمعاش لوگ اس کی ساری فریاد و فغاں سے بے پروا ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

اس موقع پر ایک بات کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ سورۂ ہود میں واقعہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا ہے اس میں یہ تصریح ہے کہ حضرت لوط کو بدمعاشوں کے اِس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے مہمان درحقیقت فرشتے ہیں۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ چند مسافر لڑکے ہیں جو ان کے ہاں آکر ٹھیرے ہیں۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کی حقیقت اس وقت کھولی جب بدمعاشوں کا ہجوم مہمانوں کی قیامگاہ پر پل پڑا اور حضرت لوط نے بے تاب ہو کر فرمایا کہ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْٓ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (کاش مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت حاصل ہوتی یا میرا کوئی سہارا ہوتا جس سے میں حمایت حاصل کرتا)۔ اس کے بعد فرشتوں نے ان سے کہا کہ اب تم اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ اور ہمیں ان سے نمٹنے کے لئے چھوڑ دو۔ واقعات کی اس ترتیب کو نگاہ میں رکھنے سے پورا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت لوط نے یہ الفاظ کس تنگ موقع پر عاجز آ کر فرمائے تھے۔ اس سورہ میں چونکہ واقعات کو ان کی ترتیب وقوع کے لحاظ سے نہیں بیان کیا جا رہا ہے، بلکہ اس خاص پہلو کو خاص طور پر نمایاں کرنا مقصود ہے جسے ذہن نشین کرنے کی خاطر ہی یہ قصہ یہاں نقل کیا گیا ہے، اس لئے ایک عام ناظر کو یہاں یہ غلط فہمی پیش آتی ہے کہ فرشتے ابتدا ہی میں اپنا تعارف حضرت لوط سے کرا چکے تھے اور اب اپنے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لئے ان کی یہ ساری فریاد و فغاں محض بناوٹی تھی۔

اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسا دی۔[۱]
اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو صاحب فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ (جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا) گذرگاہ عام پر واقع ہے۔[۲] اُس میں سامانِ عبرت ہے اُن لوگوں کیلئے جو صاحبِ ایمان ہیں۔
پھر اَیکہ والے[۳] ظالم تھے، تو دیکھ لو کہ ہم نے بھی اُن سے انتقام لیا، اور ان دونوں قوموں کے اُجڑے ہوئے علاقے کھلے راستے پر واقع ہیں۔[۴] ع
حِجر[۵] کے لوگ بھی رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں۔ ہم نے اپنی آیات اُن کے پاس بھیجیں، اپنی نشانیاں

---

[۱] یہ پکی ہوئی مٹی کے پتھر ممکن ہے کہ شہاب ثاقب کی نوعیت کے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی انفجار (Volcanic Eruption) کی بدولت زمین سے نکل کر اڑے ہوں اور پھر اُن پر بارش کی طرح برس گئے ہوں۔

[۲] یعنی حجاز سے شام، اور عراق سے مصر جاتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستہ میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے اُن آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پورے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحرِ لوط (بحیرۂ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ ویرانی پائی جاتی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

[۳] یعنی حضرت شعیب کی قوم کے لوگ۔ اس قوم کا نام بنی مدیان تھا۔ مدین ان کے مرکزی شہر کو بھی کہتے تھے اور ان کے پورے علاقے کو بھی۔ اور غالباً اَیکہ اُن کے ملک کو اس رعایت سے کہتے تھے کہ اس میں گھنے جنگل واقع ہیں۔

[۴] مدین کا علاقہ بھی حجاز سے فلسطین و شام جاتے ہوئے راستے میں پڑتا ہے۔

[۵] یہ قوم ثمود کا مرکزی شہر تھا اور اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلا سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے تبوک جاتے ہوئے یہ مقام شاہراہ عام پر ملتا ہے اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔ آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں سرخ رنگ کے پہاڑوں میں قوم ثمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں۔ ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بنائے گئے ہیں۔ ان مکانات میں اب بھی سڑی گلی انسانی ہڈیاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔

ان کو دکھائیں، مگر وہ سب کو نظر انداز ہی کرتے رہے۔ وہ پہاڑ تراش تراش کر مکان بناتے تھے اور اپنی جگہ بالکل بے خوف اور مطمئن تھے۔ آخرکار ایک زبردست دھماکے نے ان کو صبح ہوتے آلیا اور ان کی کمائی ان کے کچھ کام نہ آئی۔[۱]

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے[۲] اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے۔ پس اے محمد، تم (ان لوگوں کی بیہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔ یقیناً تمہارا رب سب کا خالق ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔[۳] ہم نے تم کو سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار دہرائی جانے کے لائق ہیں،[۴] اور تمہیں قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔[۵] تم اُس متاعِ دنیا کی طرف

---

[۱] یعنی ان کے وہ سنگین مکانات جو انہوں نے پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائے تھے ان کی کچھ بھی حفاظت نہ کر سکے۔

[۲] یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت بظاہر باطل کا جو غلبہ تم دیکھ رہے ہو اور حق کے راستہ میں جن مشکلات اور مصائب سے تمہیں سابقہ پیش آ رہا ہے، اس سے گھبراؤ نہیں، یہ ایک عارضی کیفیت ہے، مستقل اور دائمی حالت نہیں ہے۔ اس لئے کہ زمین و آسمان کا یہ پورا نظام حق پر تعمیر ہوا ہے نہ کہ باطل پر۔ کائنات کی فطرت حق کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ باطل کے ساتھ۔ لہٰذا یہاں اگر قیام و دوام ہے تو حق کے لئے ہے نہ کہ باطل کے لئے۔ (اس مضمون کی تشریح سورۂ ابراہیم رکوع ۳ و ۳ کے حواشی میں کی جا چکی ہے)۔

[۳] یعنی خالق ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی مخلوق پر کامل غلبہ و تسلط رکھتا ہے، کسی مخلوق کی یہ طاقت نہیں ہے کہ اس کی گرفت سے بچ سکے۔ اور اس کے ساتھ وہ پوری طرح باخبر بھی ہے۔ جو کچھ ان لوگوں کی اصلاح کے لئے تم کر رہے ہو اسے بھی وہ جانتا ہے اور جن ہتھکنڈوں سے وہ تمہاری سعیِ اصلاح کو ناکام کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں ان کا بھی اسے علم ہے۔ لہٰذا تمہیں گھبرانے اور بے صبر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مطمئن رہو کہ وقت آنے پر ٹھیک ٹھیک انصاف کے مطابق فیصلہ چکا دیا جائیگا۔

[۴] یعنی سورۂ فاتحہ کی آیات۔ اگرچہ بعض لوگوں نے اس سے مراد وہ سات بڑی بڑی سورتیں بھی لی ہیں جن میں دو دو سو آیتیں ہیں، یعنی البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور یونس یا انفال و توبہ۔ لیکن سلف کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ اس سے سورۂ فاتحہ ہی مراد ہے بلکہ امام بخاری نے دو مرفوع روایتیں بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کی ہیں کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سبع من المثانی سے مراد سورۂ فاتحہ بتائی ہے۔

[۵] (اس کا حاشیہ صفحہ ۹۲ پر دیکھیں)

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے، اور نہ ان کے حال پر اپنا دل کڑھاؤ۔[1] انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی طرف جھکو اور (نہ ماننے والوں سے) کہہ دو کہ میں تو صاف صاف تنبیہ کر دینے والا ہوں۔ یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی ہم نے ان تفرقہ پردازوں کی طرف بھیجی تھی جنہوں نے اپنے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے۔[2] تو قسم ہے تیرے رب کی، ہم ضرور ان سب سے

(حاشیہ ۵ صفحہ ۹۱) یہ بات بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی تسکین و تسلی کے لئے فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب حضور اور آپ کے ساتھی سب کے سب انتہائی خستہ حالی میں مبتلا تھے۔ کار نبوت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضور کی تجارت قریب قریب ختم ہو چکی تھی اور حضرت خدیجہ کا سرمایہ بھی دس بارہ سال کے عرصے میں خرچ ہو چکا تھا۔ مسلمانوں میں سے بعض کم سن نوجوان تھے جو گھروں سے نکال دیے گئے تھے۔ بعض صنعت پیشہ یا تجارت پیشہ تھے جن کے کاروبار معاشی مقاطعہ کی مسلسل ضرب سے بالکل بیٹھ گئے تھے، اور بعض بیچارے پہلے ہی غلام یا موالی تھے جن کی کوئی معاشی حیثیت نہ تھی۔ اس پر مزید یہ ہے کہ حضور سمیت تمام مسلمان مکے اور اطراف و نواح کی بستیوں میں انتہائی مظلومی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر طرف سے مطعون تھے۔ ہر جگہ تذلیل و تحقیر اور تضحیک کا نشانہ بنے ہوئے تھے، اور قلبی و روحانی تکلیفوں کے ساتھ جسمانی اذیتوں سے بھی کوئی بچا ہوا نہ تھا۔ دوسری طرف سرداران قریش دنیا کی نعمتوں سے مالا مال اور ہر طرح کی خوشحالیوں میں مگن تھے۔ ان حالات میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم شکستہ خاطر کیوں ہوتے ہو، تم کو تو ہم نے وہ دولت عطا کی ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ساری نعمتیں ہیچ ہیں۔ رشک کے لائق تمہاری یہ علمی و اخلاقی دولت ہے نہ کہ ان لوگوں کی مادی دولت جو طرح طرح کے حرام طریقوں سے کما رہے ہیں اور طرح طرح کے حرام راستوں میں اس کمائی کو اڑا رہے ہیں اور آخر کار بالکل مفلس و قلاش ہو کر اپنے رب کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں۔

[1] یعنی ان کے اس حال پر کہ اپنے خیر خواہ کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ اپنی گمراہیوں اور اخلاقی خرابیوں کو اپنی خوبیاں سمجھے بیٹھے ہیں، خود اس راستے پر جا رہے ہیں اور اپنی ساری قوم کو اس پر لئے جا رہے ہیں جس کا یقینی انجام ہلاکت ہے، اور جو شخص انہیں سلامتی کی راہ دکھا رہا ہے اس کی سعی اصلاح کو ناکام بنانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کیے ڈالتے ہیں۔

[2] اس گروہ سے مراد یہود ہیں۔ ان کو مُقْتَسِمِین اس معنی میں فرمایا گیا ہے کہ انہوں نے دین کو (باقی صفحہ ۹۳ پر)

پوچھیں گے کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔
پس اے نبی! جس چیز کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے اُسے ہانکے پکارے کہہ دو اور شرک کرنے والوں کی ذرا پروا نہ کرو۔ تمہاری طرف سے ہم اُن مذاق اڑانے والوں کی خبر لینے کے لئے کافی ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ دوسرے خدا بنا رکھے ہیں۔ عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔
ہمیں معلوم ہے کہ جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان سے تمہارے دل کو سخت کوفت ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اس کی جناب میں سجدہ بجا لاؤ، اور اُس آخری گھڑی تک اپنے رب کی بندگی کرتے رہو جس کا آنا یقینی ہے[۱]۔ ع

(بقیہ حاشیہ ص ۹۲) تقسیم کر ڈالا، اس کی بعض باتوں کو مانا، اور بعض کو نہ مانا، اور اس میں طرح طرح کی کمی بیشی کر کے بیسیوں فرقے بنالئے۔ ان کے "قرآن" سے مراد توراۃ ہے جو ان کو اسی طرح دی گئی تھی جس طرح اُمّت محمدیہ کو قرآن دیا گیا ہے۔ اور اُس "قرآن" کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنے سے مراد وہی فعل ہے جسے سورۂ بقرہ رکوع ۱۰ میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ (کیا تم کتاب اللہ کی بعض باتوں پر ایمان لاتے ہو اور بعض سے کفر کرتے ہو؟)۔ پھر یہ جو فرمایا کہ یہ تنبیہ جو آج تم کو کی جا رہی ہے یہ ویسی ہی تنبیہ ہے جیسی تم سے پہلے یہود کو کی جا چکی ہے، تو اس سے مقصود دراصل یہود کے حال سے عبرت دلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے خدا کی بھیجی ہوئی تنبیہات سے غفلت برت کر جو انجام دیکھا ہے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اب سوچ لو، کیا تم بھی یہی انجام دیکھنا چاہتے ہو؟

[۱] یعنی تبلیغ حق اور دعوتِ اصلاح کی کوششوں میں جن تکلیفوں اور مصیبتوں سے تم کو سابقہ پیش آتا ہے، ان کے مقابلے کی طاقت اگر تمہیں مل سکتی ہے تو صرف نماز اور بندگی رب پر استقامت سے مل سکتی ہے۔ یہی چیز تمہیں تسلّی بھی دے گی، تم میں صبر بھی پیدا کرے گی، تمہارا حوصلہ بھی بڑھائے گی، اور تم کو اس قابل بھی بنادے گی کہ دنیا بھر کی گالیوں اور مذمتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے میں اُس خدمت پر ڈٹے رہو جس کی انجام دہی میں تمہارے رب کی رضا ہے۔

عہدِ نبوّت کے عمرانی اور تمدّنی مسائل

(حکیم حمید الزمان صاحب صدیقی)

عقل و شعور اور دلِ درد مند رکھنے والے ہر انسان کی نگاہِ تجسّس ایک ایسی نئی دنیا کی تعمیر کے لئے وقفِ انتظار ہے جس کی ہر صبح مسرت بدوش اور حیات آفریں ہو اور ہر شام سکون بخش اور گہوارۂ راحت ہو۔ وہ کون ہوگا جو ایسی انسانی سوسائٹی کی ضرورت نہ محسوس کرتا ہوگا جس کا ہر فرد خدا ترس، خود آگاہ اور فرض شناس ہو، جس کے حدودِ مملکت میں ہر انسان زندگی کی حقیقی لذتوں سے لطف اندوز ہو، جہاں ایک دل بھی بالادست انسانوں کی چیرہ دستیوں سے اندوہگیں نہ ہو اور نہ کوئی آنکھ زندگی کی محبوب اور حسین تمناؤں کی پامالی سے نمناک ہو۔

بلاشبہ ایک سنجیدہ فکر اور با احساس انسان کے لئے از حد مشکل ہے کہ وہ محنت کش اور دُکھیا انسانوں کی چیخ پکار، اخلاق و شرافت کی رسوائی، متاعِ انسانیت کی پامالی اور انسانی خون کی ارزانی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس پر خون کے آنسو نہ بہائے لیکن اس کا کیا علاج کیا جائے کہ اس بے نور اور بے ذوق دورِ انسانیت میں درندہ صفت جاہ پرستوں کی کوئی کمی نہیں مگر ایسے بالغ النظر لوگ بہت کمیاب ہیں جو زمانہ کی رگِ نبض کو پہچان کر بیمار دنیا کے لئے نسخۂ شفا مہیا کر سکیں۔ ورنہ مبدأ فیض کے دار الشفا میں ہر درد کا علاج موجود ہے اور سازِ فطرت میں نغمہ ہائے زندگی کی کوئی کمی نہیں ؎

تو راہ شناس نئی وز مقام بے خبری — چہ نغمہ ایست کہ در بربط سلیمی نیست

دورِ حاضر کا انسانی دماغ جن عملی مسائل سے اُلجھا ہوا ہے وہ ہمارے ہی زمانہ کی پیداوار نہیں ہیں، بلکہ وہ ہمیشہ سے انسانی فکر و توجہ کا مرکز بنے رہے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ہر دوسرے دور میں پہلے دور کی نسبت سے ان مسائل کی سطحی نوعیت و ضعیت بدلتی رہی ہو۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ بدلتی رہی ہے لیکن زندگی کے واقعی اور حقیقی مطالبات ہر زمانہ میں ایک جیسے رہے ہیں اور اس لئے زندگی سے تعلق رکھنے والے عملی مسائل بھی بنیادی طور پر یکساں ہی رہے ہیں۔ اس بنا پر عقل و بصیرت اور دیانت و انصاف کا اقتضا یہ ہے کہ مسائل حاضرہ کے عملی حل کے لئے

انسانی تاریخ کا تحقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ کیا ماضی کے کسی دور میں ان مسائل کا مؤثر عملی حل پیش کیا گیا ہے اور کیا کسی انقلابی تصورِ حیات کے ذریعہ ایسی پاکیزہ انسانی سوسائٹی کی تشکیل عمل میں آئی ہے جس کا ذکر پچھلی سطور میں کیا گیا ہے؟ اگر کسی انسانی دور میں ایسا ہوا ہے تو ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی کہ ہم اس مقدس انقلاب کے بانی کی پاکیزہ زندگی کی رہنمائی قبول کرنے کے بجائے کسی ایسے شخص کی رہنمائی قبول کریں جو راہ و رسمِ منزل سے ناآشنا ہے۔ یقیناً آج انسانی دنیا کی آفاق گیر تباہی و بدامنی اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ آج انسانوں کی زمامِ کار اُن ائمۂ ضلالت کے ہاتھ میں ہے۔ جو اُن کو خدا اور اُس کے پیغمبروں کی راہ سے پھیر کر فساد و معصیت کی راہ پر چلا رہے ہیں ؎ لایفلح الناس فوضی لاسراۃ لہم ولاسراۃ اذا جہالہم سادوا

یہ مقدس انقلاب جو چھٹی صدی میں ظہور پذیر ہوا پوری انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا پہلا انقلاب تھا۔ جس کی تہ میں عالمگیر اور بین الانسانی تصورِ حیات کارفرما تھا۔ اور جس نے انسانوں کا زاویۂ نگاہ، زندگی کا نقطۂ نظر اور فکر و نظر کی دنیا ہی بدل ڈالی تھی۔ یہاں تک کہ کرۂ ارضی پر بسنے والا کوئی انسان ایسا نہ رہ گیا تھا جو اس حیرت انگیز انقلاب سے متأثر نہ ہوا ہو۔

زیرِ نظر مقالہ میں یہ دیکھنا ہے کہ دنیائے انسانیت کے امیرِ اعظم حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کارِ نبوت کا آغاز کیا تھا تو اس وقت آپ کو کن کن مسائل سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اور آپ نے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کونسا طریق کار اختیار فرمایا تھا۔ نیز یہ کہ وہ مسائل اُس زمانہ کے وقتی مسائل تھے یا ان میں اور زمانۂ حال کے مسائل میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے؟ اگر دوسری صورت ہے یعنی عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل جن کو اربابِ علم و دانش کی پیہم اور لگاتار کاوشیں آج تک حل کرنے سے قاصر رہی ہیں، بنیادی حیثیت سے متذکرہ بالا دورِ انقلاب کے انسانی مسائل سے مختلف نہیں ہیں، تو اس صورت میں آج بھی وہی ہمہ گیر تصورِ حیات اور اُسی طرز کی عملی جد و جہد انسانی دنیا کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کر سکتی ہے۔ اور اُس کے نتیجہ میں ایک مقدس اور پاکیزہ انسانی سوسائٹی معرضِ وجود میں آ سکتی ہے۔

زمانہ قبل نبوت کے اجتماعی مفاسد جس انسانی دور میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کا آغاز کیا۔ اگر اُس کا موازنہ موجودہ دور سے کیا جائے تو ان میں اس لحاظ سے یقیناً اختلاف پایا جاتا ہے کہ

موجودہ دور علم و تہذیب کے اعتبار سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اور انسانی تمدن کی ارتقائی حرکت اور علوم سائنس کی حیرت انگیز وسعت و ترقی نے انسان کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور جس تاریخی دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ وہ تاریک خیالی، وہم پرستی، جہالت اور علمی کم مایگی کا بدترین دور تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر مسائل زندگی کے اُلجھاؤ کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی واضح اور حقیقی فرق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ وہاں علم و ہنر کا فقدان انسانیت کے لئے بلائے بے درماں تھا۔ اور یہاں حکمت و دانش کا غلط استعمال اہلِ دنیا کے لئے وجہِ ہلاکت بن گیا ہے ۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

بہرحال سطورِ ذیل میں قبل از نبوت دور کے اُن بنیادی مفاسد کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس وقت انسانی دنیا کو ہلاکت و بربادی کی طرف دھکیل رہے تھے اور بغیر ان کی اصلاح کے کوئی امید نہ تھی۔

بے روح اور غلط کارانہ مذہب پرستی | مذہب انسانی اجتماعیت کا قدیم ترین اور مؤثر ترین عنصر ہے اور اگر وہ الہامی صداقتوں اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت پر مبنی ہو تو اپنے ماننے والوں میں خدا ترسی، حق پرستی اور ذکر و فکر کی اعلیٰ صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز قدرِ حریت کی نگہداشت اور حقوقِ انسانی کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ایک سچا مذہب ایک لمحہ کے لئے بھی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ اس کے ماننے والا خواہشات نفس کی تکمیل کے لئے انسانی آبادیوں کو پامال کرنے اور بے گناہ انسانوں کی لاشوں پر اپنا تختِ جبروت بچھائے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر روح فرسا اور اندوہناک ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ اہلِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی روح کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی ہو۔ ورنہ آج تک جو کچھ دیکھا اور سنا گیا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیشہ مذہب کے نام سے دنیا کے بدترین بہیمیت ناک خونی ڈرامے کھیلے گئے اور مذہب کے پردہ میں ظلم و طغیان، مذاہب کے گروہ اور پیشوا تک کرتے رہے کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اس سے شیطان کی روح بھی لرز جاتی رہی ہو گی۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے بالکل حقیقت پر مبنی ہے اور سوائے چند مستثنیات کے مذہب کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے۔ لیکن جس انسانی دور میں دنیا کے آخری ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ دعوت کیا وہ

اس حیثیت سے بدترین دورِ انسانیت تھا یعنی اُس دور میں مختلف مذاہب کو ماننے والے لوگ جس طرح مذہب کی توہین و تذلیل کر رہے تھے اُس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلانِ نبوت کے وقت دُنیا میں یہودیت، مسیحیت، مجوسیت، حنیفیت ہندوازم، بدھ ازم وغیرہ مذاہب کو ماننے والے لوگ بکثرت موجود تھے۔ لیکن بے لوث خدا پرستی اور حقیقت شناسی کسی مذہب میں موجود نہ تھی۔ ہر مذہب چند رسوم و ظواہر کا مجموعہ رہ گیا تھا جو مختلف گروہ بندیوں کے لئے محض تبلیل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہر مذہبی گروہ اپنی غلط کارانہ روش کو عین صواب سمجھتا تھا اور دوسروں کی اچھی چیز بھی اُس کی نگاہ میں بُری تھی گویا اُن کے نزدیک حق و باطل کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جو چیز اُن کی طرف منسوب تھی وہ حق اور جو دوسروں میں پائی جاتی تھی وہ باطل تھی۔ اس غلط بینی اور اعتقادی گمراہی کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ مختلف گروہ بندیوں میں کوئی اصولی، اعتقادی اور عملی چیز وجہ اشتراک نہ رہی تھی بلکہ ہر گروہ دوسرے گروہ سے بالکلیہ مغایرت رکھتا تھا اور اسی چیز نے اُن گروہ بندیوں میں شدید نفرت اور عصبیت پیدا کر دی تھی۔

قَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ (بقرہ)	یہود نے کہا نصرانی کسی مذہب حق پر نہیں ہیں اور نصرانیوں نے کہا یہود حق پر نہیں ہیں حالانکہ یہ دونوں گروہ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔

یہ نفرت و عصبیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ سے ناروا سلوک کرنے میں کوئی قباحت نہیں تصور کرتے تھے۔ دوسروں پر ظلم و تشدد کرتے۔ اُن سے بددیانتی کرتے۔ بلکہ اُن کے مقابلہ میں ہر بد اخلاقی کو روا سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم نے یہود کے نقطۂ خیال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ (الآیہ)	امیین (غیر اہل کتاب) کے بارے میں ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس زمانہ کے اخلاقی تسفل و انحطاط کا صحیح اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذہب کی عالمگیر سچائیوں پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں اور جن کی نگاہِ حقیقت شناس نیکی کو ہر حال میں نیکی اور برائی کو ہر حال

میں بُرائی تصور کرتی ہے خواہ نیکی اور برائی کا تعلق اپنوں سے ہو یا بیگانوں سے! لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ مذاہب، مذہب کی اس سیدھی سادی حقیقت سے بھی آشنا نہ تھے۔

دین و مذہب کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ انسانی قلب و نظر کو ذوقِ تجسس اور امتیازِ حق و باطل کی گہری بصیرت عطا کرتا ہے اور انسانی قوائے فکر و عمل کو معین حدود اخلاق کے زیر اثر نشو و نما دیتا ہے۔ اس لئے جو لوگ مذہب کی حقیقت سے آگاہ ہیں اُن کی دُوررس نگاہ کفر و معصیت کے ہر چہار سُو چھائے ہوئے دھندلکے میں بھی حق و صداقت کی متلاشی رہتی ہے اور زندگی کی تگ و دو میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کی طلب و جستجو اور ذوقِ حق پرستی میں کسی قسم کی کمی نہیں واقع ہوتی بلکہ ان کا جذبۂ شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ لیکن جس قوم میں خدا پرستی کی حقیقی رُوح فنا ہو جاتی ہے اس کی آنکھوں سے ایمان و عمل کے حیات آفریں حقائق اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے مذہب کی سطحی اور ثانوی درجہ کی باتوں پر ہی قناعت کر لیتی ہے یا دینِ آبائی کے اوہامِ باطلہ کو حقیقت تصور کر لیتی ہے۔

اِنَّھُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَاۤءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ	ان لوگوں نے اللہ کے مقابلہ میں شیطانوں کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور سمجھتے ہیں کہ وہ راہ راست پر چل رہے ہیں۔

(الاعراف - ۳)

یعنی چنانچہ صرف مذہبی مراسم جن پر عمل کرنے سے کچھ دینا اور کھونا نہ پڑتا ہو ان کی اہمیت کو ضرورت سے زیادہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ احکام دینی جن میں قربانی جان و مال اور ترک عیش و نشاط کا مطالبہ ہو ان کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جاتا ہے گویا اب ان احکام کی ضرورت ہی نہیں یا وہ بالکل منسوخ ہو چکے ہیں یا خدائی دین کے مقابلہ میں بالکل ایک نیا دین تراش لیا جاتا ہے اور پھر اسی کو خدائی دین کا نام دے دیا جاتا ہے یہی وہ اعتقادی و عملی گمراہی ہے جو ہر زمانہ میں قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتی رہی ہے ؎

مرشدِ رومی حکیمِ پاک زاد سرِ مرگ و اتناں بر ما کشاد
ہر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود زانکہ بر جندل گماں بُرد ند عود

دورِ نبوت کے یہود و نصاریٰ کی بالکل یہی حالت تھی کہ ان کو دین کی زندہ اور متحرک روح سے کوئی

سروکار نہ تھا بلکہ انہوں نے دین کو خواہشاتِ نفس کا تابع بنا رکھا تھا۔ جہاں مذہب کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتا وہ کمال دیدہ دلیری سے احکامِ مذہب کی قطع و برید کر کے ان کو خواہشِ نفس کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔ یُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ (الآیہ) ان میں تیکر... دبار اور صواب و ناصواب کی تمیز ہی باقی نہ رہی تھی، علماء و مشائخ ان کو جس راہ پر ڈال دیتے یہ لوگ اسی راہ پر چل پڑتے تھے۔

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ (الآیہ)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنا رکھا ہے۔

یہود صرف اس بات کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے تھے کہ وہ اسرائیلی یا یہودی النسل ہیں اور نصرانی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کو مان لینا ہی فلاح و نجات کے لئے کافی ہے لیکن ان کی عملی زندگی کو دیکھ کر کسی کو یقین نہ آسکتا تھا کہ وہ فی الواقع کسی پیغمبر کی رہنمائی کو مانتے اور اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان کی اس گمراہی کا بار بار ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کچھ یہودیوں اور مسلمانوں میں بات چل نکلی، یہودیوں نے دعویٰ کیا کہ "ہمارا مذہب سچا ہے اور نجاتِ اُخروی کا استحقاق بغیر ہمارے کسی کو نہیں ہے"۔ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں نے کہا "ہمارے نبی سب سے آخری نبی ہیں اور ہمارا دین آخری اور مکمل دین ہے"۔ لیکن ذیل کی قرآنی آیت میں ان لوگوں سے وانشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ محض دین و مذہب کی نمائش سے کچھ نہیں بنے گا، اصل چیز ایمان و عمل ہے، اگر یہ نہیں تو محض کسی مذہب کا قائل و برتر ہونا تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔[۱]

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ

نہ تمہاری آرزوئیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں کام آئیں گی، (خدا کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ) جو شخص برائی کریگا اس کو اس کی سزا ملے گی اور نہیں پائے گا وہ اللہ کے سوا کوئی دوست اور نہ مددگار، اور جو نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن بھی ہو تو وہ جنت میں

[۱] ابن جریر،

نَقِيرًا ۔ (النساء)

داخل ہوگا، اور اس پر ذرہ برابر بھی ظلم نہ ہوگا۔

یہود کی عملی حالت کا نقشہ جو قرآن حکیم نے کھینچا ہے اس سے ان کی اخلاقی پستی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۔ (المائدہ)

آپ ان میں سے بہتوں کو دیکھیں گے کہ گناہ و سرکشی اور حرام خوری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، بہت ہی بُرے ہیں وہ اعمال جو وہ کرتے ہیں، ان کے علماء اور مشائخ ان کو گناہ و معصیت کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے! بہت ہی بُرا ہے وہ کام جو وہ کرتے ہیں۔

اور عام اہلِ کتاب سے قرآنِ حکیم نے یوں خطاب کیا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ (مائدہ)

اے پیغمبر! آپ کہدیں: اے علمبردارانِ کتاب! تم کسی صداقت پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ و انجیل اور اُن احکام کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر اتارے گئے ہیں پوری طرح قائم نہ کرو۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۔ (النساء)

اے اہل کتاب تم اپنے دین میں غلو نہ کرو، اور اللہ کی ذات پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہو۔

مدینہ منورہ اور اس کے اردگرد یہود کثرت سے آباد تھے۔ یہ لوگ بخت نصر کے حملۂ بیت المقدس کے زمانہ میں مدینہ میں آرہے تھے[1]۔ مدینہ منورہ کے علاوہ یہ لوگ خیبر، فدک، وادی القریٰ میں بھی آباد تھے۔ نیز عرب سے باہر یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک میں بھی پائے جاتے تھے لیکن ان کی کوئی جداگانہ ریاست دنیا کے کسی حصہ میں موجود نہ تھی۔ عرب میں ان کا ذریعۂ معاش تجارت، کھیتی باڑی اور سودی کاروبار تھا۔ یہ لوگ حد درجہ کے لالچی اور سنگدل تھے۔ بڑی بڑی شرحوں پر سودی رقمیں دیتے تھے اور کفالت کے طور پر لوگوں کے بچے بلکہ مستورات تک کو اپنے پاس رہن رکھتے تھے۔ ان میں دولت کی کثرت تھی۔ اس وجہ سے ان میں زنا و فحاشی کی کوئی حد نہ تھی اور علماء یہود نے اپنے امراء کی دلجوئی

[1] طبری۔

سکے۔ زنا کی سزا (جو تورات نے مقرر کی تھی) ہی بدل ڈالی تھی۔

مسیحی مذہب کے پیرو عرب میں بکثرت موجود تھے۔ ابنِ قُتَیبہ کا بیان ہے کہ قبائل ربیعہ و غسّان عیسائی تھے، قضاعہ میں بھی عیسائیت کا اثر پایا جاتا تھا بلکہ مکہ معظمہ میں بھی کچھ پیروانِ مسیحیت پائے جاتے تھے۔ چنانچہ ورقہ بن نوفل جو ایک خداشناس عیسائی اور عبرانی زبان کے ماہر تھے، مکہ معظمہ کے رہنے والے تھے۔

عیسائیوں میں اگرچہ کچھ بچے کھچے ایسے لوگ بھی تھے جو دل میں اللہ کا خوف رکھتے تھے اور ٹھیک ٹھیک مسیحی مذہب پر عمل پیرا تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی قرآن حکیم نے بھی تعریف کی ہے اور ایک مستند حدیث میں "اِلّا بقایا من اہل الکتاب" کے الفاظ سے ان کو اس وقت کی گمراہ قوموں سے الگ کیا گیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ان کی عظیم اکثریت سخت گمراہی میں مبتلا تھی۔ چنانچہ ایک مسیحی مصنف ڈریپر لکھتا ہے:-

"عیسائیوں کے عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر شامل ہو گیا تھا، عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھل گیا تھا"[لہ]

اس زمانہ میں ایک گروہ مریمی کے نام سے پیدا ہوا تھا جو حضرت مریمؑ کو بھی شریکِ الوہیت تصور کرتا اور آقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا۔ نیز اس زمانہ میں مسیحی فرقوں کے دلچسپ مسائل جن پر وہ پوری قوت صرف کر رہے تھے یہ تھے کہ حضرت مسیحؑ میں صرف خدائی طبیعت پائی جاتی ہے یا خدائی اور انسانی دونوں طبیعتیں ان میں جمع ہیں؟ اگر دونوں ہیں تو ان کا منشا ایک ہے یا الگ الگ!

نصرانیوں کی اخلاقی حالت یہود سے کچھ کم افسوسناک نہ تھی۔ زمانہ نبوت سے پہلے یہ لوگ دنیا کے بہت بڑے حصہ پر حکمران تھے اور دولت و اقتدار نے ان میں خطرناک حد تک ذمائم اخلاق پیدا کر دیئے تھے۔ زنا، مے نوشی، رشوت خوری اور دیگر اخلاقی بیماریاں ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئی تھیں۔ حضرت اقبال نے دورِ حاضر کے فرنگیوں کی زہر آلود معاشرت پر بڑی خوبی سے طنز کیا ہے ؎

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبیٔ عفت و غمخواری و کم آزاری

لہ معرکۂ مذہب و سائنس ص۳۲

صلہ فرنگ سے آیا ہے سومنات کے لئے مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

لیکن حقیقت یہ ہے کہ عہدِ رسالت کے ابتدائی دور میں عیسائیوں کی اخلاقی حالت کسی لحاظ سے انیسویں اور بیسویں صدی کی عیسائیت سے بہتر نہ تھی۔

مجوسیت کا سرچشمہ ایران کی سرزمین تھی لیکن عرب میں بھی کہیں کہیں اس کے اثرات پائے جاتے تھے۔ چنانچہ مورخین نے لکھا ہے کہ عرب کا قبیلہ تمیم مجوسی تھا اور اس دور کے مجوسیوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت ہمعصر اقوام سے کہیں زیادہ دردناک تھی۔ زمانۂ بعثت نبوی سے بہت پہلے ایران کے مشہور رہنما مانی نے عیسائیت و مجوسیت کے اجزا سے عجیب و غریب معجون تیار کیا تھا۔ ایک طرف اس کی جدت نوازی کا یہ حال کہ بیٹی اور بہن کی حرمت اٹھادی تھی چنانچہ ایران کے ایک حکمران یزدگرد ثانی نے جو اس شریعت کا پیرو تھا اپنی بیٹی سے نکاح کیا اور کچھ مدت بعد اس کو قتل کر دیا۔[1]

اس کے بعد ایک اشتراکیت پسند مزدک نامی مصلح پیدا ہوا جس نے یہ تعلیم دی کہ دولت اور عورت کسی کی ملکیت نہیں۔ اس دین کی اشاعت میں عیاش حکام و امراء نے سرگرم حصہ لیا کیونکہ یہ نیا دین ان کی تعیش پسندانہ طبائع سے مناسبت رکھتا تھا۔

قریش کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ کعبۃ اللہ کے نگہبان اور ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ یہود و نصاریٰ کے دعووں سے زیادہ بے حقیقت اور بے مغز تھا۔ ملت ابراہیمی کا بنیادی عقیدہ توحید ہے لیکن ان لوگوں کی زندگی کے کسی ایک گوشہ میں بھی توحید کا شائبہ تک موجود نہ تھا بلکہ وہ شدید درجہ کی توہم پرستی اور شرک و بدعت میں مبتلا تھے اور ان کے معبودان باطل کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ہاں بہت قلیل تعداد میں کچھ ایسے اشخاص بھی ان میں موجود تھے جن کے ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو چکے تھے اور وہ اپنی خداداد بصیرت سے اس حقیقت کو جان گئے تھے کہ انسان کا مقام اس سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے گھڑے ہوئے معبودوں کے سامنے سر نیاز خم کرے۔ چنانچہ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی بت کے سالانہ میلے میں ورقہ بن نوفل، عبید اللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل شریک تھے۔ ان لوگوں نے یک لخت ہی محسوس کیا کہ یہ کیا حماقت ہے کہ ہم انسان ہو کر پتھروں کے سامنے جھکتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان لوگوں نے حق و صداقت

[1] مورخین کی تاریخ عالم ص۸۲۱ بواسطہ سیرت نبوی جلد ۴

کی جستجو شروع کر دی۔ ورقہ، عثمان اور عبداللہ نے مسیحی مذہب قبول کر لیا اور زید نے دینِ حنیفی کی تلاش میں شام کا سفر کیا، کئی پادریوں اور راہبوں سے ملے، لیکن جس چیز کی ان کو تلاش تھی اس کا سراغ نہ ملا اور بالآخر اس اجمالی ایمان کو کافی سمجھا کہ "میں ابراہیم کا دین قبول کرتا ہوں"۔ اسی طرح امیّہ بن صلت جو طائف کے رئیس اور مشہور شاعر تھے، نے بھی بت پرستی کی مذمت کی تھی۔ غالباً یہ وہی امیہ ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا "اس کا دل مومن اور دماغ کافر تھا"۔

دورِ جاہلیت کے کچھ سنجیدہ فکر اور صحیح الخیال اہلِ سخن کا کلام عربی لٹریچر میں ملتا ہے۔ نابغہ اور زہیر ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، چنانچہ نابغہ کے اس شعر سے اُن کی توحید پرستی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حَلَفْتُ فَلَمْ اَتْرُكْ لِنَفْسِكَ رِيْبَةً وَلَيْسَ وَرَاءَ اللهِ لِلْمَرْءِ مَذْهَبٌ[1]

اور زہیر کے اس شعر سے ان کی وسعتِ نظر اور دقیقہ سنجی کا پتہ چلتا ہے:-

فَاِنَّ الْحَقَّ مَقْطَعُهٗ ثَلٰثٌ يَمِيْنٌ اَوْ نِفَارٌ اَوْ جِلَاءٌ

ان کے علاوہ ایک جاہلی شاعر کا یہ مشہور شعر ہماری درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے:

اَرَبًّا وَاحِدًا اَمْ اَلْفَ رَبٍّ اَدِيْنُ اِذَا تَقَسَّمَتِ الْاُمُوْرُ

غرض سخنِ عشق کی آواز جاہلیت کے بے نور اور گھناؤنے دور میں بھی کہیں کہیں اُٹھ رہی تھی مگر اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے موجودہ مادّہ پرستانہ ماحول میں صدائے حق کی ہے۔ اور عربوں کا عام مذاق ذوقِ خدا پرستی سے قطعی ناآشنا تھا۔

مدینہ منورہ کے مشرک قبائل اوس و خزرج کی دینی حالت بھی یہی تھی۔ یہ لوگ صدیوں پہلے جنوبی عرب زمین سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ سیل العرم کے زمانہ میں جو لوگ اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے اوس و خزرج بھی انہیں میں سے تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مستقر بنا لیا تھا۔ اور یہود سے عہد و پیمان کر لیا تھا[2]۔

بعثتِ نبوی کے وقت ہندوستان کے ہندو اپنی تاریخ کے تاریک دور میں داخل ہو چکے تھے ربانی صفت پر

[1] اغانی تذکرہ نابغہ جلد ۹۔ [2] ابن کثیر صفحہ ۲۲۲۔

عُلماءِ کرام کی خدمت میں

گذشتہ اشاعت میں ان فتووں اور اشتہارات کا ذکر آچکا ہے جو دیوبند، مظاہر العلوم، تھانہ بھون اور دہلی کے بعض مشہور علماء کے قلم سے نکلے ہیں۔ اب ہمیں ایک اور اشتہار وصول ہوا ہے جسے ہندوستان سے لاکر پاکستان میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:-

حضرت مولانا مدنی کا بصیرت افروز بیان

مولانا مولوی عبدالحمید بلندشہری مدرس مدرسہ اشرف العلوم گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک خط کا وہ اقتباس ہے جو انہوں نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی عمت فیوضہم کو لکھا ہے۔ ذیل میں صرف وہ حصہ ہے جس کا تعلق اس جماعت سے ہے جس نے اپنا نام جماعت اسلامی رکھا ہے۔

"یہ خیال اس وقت سے پیدا ہوا ہے جب سے مودودیت جو کہ گنگوہ میں حضرت خفتہ اختیار کئے ہوئے ہے کچھ تبادلۂ خیالات اور کچھ ان کے اخبارات کا مطالعہ تردیداً کیا گیا یہ لوگ صحابہؓ تک متجاوز کہہ دیتے ہیں، چنانچہ حضرت علیؓ، ابن عمرؓ، عائشہ رضی اللہ عنہا وعنہم کو احیاء تبلیغ دین میں متجاوز عن الاعتدال کے الفاظ اختیار کئے ہیں۔ نیز خود مسلک اعتدال میں فرماتے ہیں کہ میں نے اشخاص ماضی وحال بلا واسطہ دین کو کتاب السنہ، کتاب اللہ سے سمجھا ہے۔ نیز حضرت حاجی علیہ الرحمتہ و مجدد الف ثانی علیہ الرحمتہ کے متعلق لکھتے ہیں ان حضرات نے ابتدائے زندگی میں تو اچھا کام کیا مگر اخیر عمر میں ایسی مسموم غذا مسلمانوں کو دے گئے ہیں کہ آج تک مسلمان اس کے زہر سے محفوظ نہیں ہے اور بھی تنقیدات تصوف پر بہت کی ہیں۔ بعض اہل گنگوہ نے دیگر بعض کو حضرت بوسعید علیہ الرحمتہ کے مزار پر جانے سے روکتے ہوئے کہا کہ ایک سنیاسی ہے جو پتھروں میں پڑا ہے اور یہ مشہور مقولہ ہے مودودیوں کا کہ دیوبند مظاہر العلوم میں خرافاتی کے مینڈھے تیار کئے جاتے ہیں علماء پر زبردست ریمارک خاصکر ماضی وحال کے

بزرگوں پر غرض بالتفصیل پھر عرض کرونگا اسوقت یہ عرض کرنے کا مقصد ہے کہ آیا ہم کو مل کر ان لوگوں کو جواب دیں کیونکہ خاکسار گنگوہ سے مجھکو واسطہ ہے وہاں پر میں اشرف العلوم میں خدمت کرتا ہوں اور شب و روز یہ منکرات سامنے آتے رہتے ہیں تو لامحالہ کہنا پڑتا ہے۔ جواب شافی سے نوازیں؟"

عبدالحمید بلند شہری

الجواب: انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ خواہ صحابہ اکرام ہوں یا اولیاء عظام یا ائمہ حدیث وفقہ وکلام کوئی بھی معصوم نہیں ہے سب سے غلطیاں تو ہو سکتی ہیں مگر ان کے متعلق اعتماد کی شہادتیں قرآن حدیث میں بکثرت موجود ہیں اور ان کے اعمالنامے اور انتقاد و علم کی تاریخی روایات معتبرہ اس قدر امت کے پاس ہیں کہ قرون حالیہ کے پاس ان کا عشر عشیر بھی نہیں ہے ان پر تنقید ان ہی جیسے پایہ علم و انتقاد والا کر سکتا ہے ہمارے زمانہ کے ٹٹ پونجئے جن کے پاس علم ہے نہ تقوی کیا منہ رکھتے ہیں کہ زبان درازکریں سوائے اپنی بدبختی کے اظہار کے اور کیا حیثیت رکھتے ہیں ؎ چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد ؂ میلش اندر طعنہ پاکاں نہد اللہ تعالیٰ ان کی تعریف فرماتے ہوئے فرماتا ہے محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار الآیۃ دوسری جگہ ہے۔ ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم الآیۃ تیسری جگہ ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ الآیۃ۔ چوتھی جگہ ہے وکذلک جعلناکم امۃ وسطا الآیۃ اور یہ کم بخت انکی شان میں بدزبانی بکتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اللہ اللہ فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا۔ الحدیث۔ اللہ سے ڈرو میرے اصحاب کے متعلق میرے بعد انکو نشانہ ملامت مت بناؤ آپ فرماتے ہیں خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم الحدیث اور یہ بدبخت ان کی شان میں بدزبانیاں کرتے ہیں سوائے بدبختی کے اور کیا ہے۔ ان خبیثوں سے گفتگو اور مناظرہ وغیرہ کرنا اپنے وقت کو ضائع

لہ عبارت کی تمام غلطیاں اور بے ربطیاں جوں کی توں اشتہار ہی سے نقل کی گئی ہیں۔ کاتب ترجمان یا ادارہ ترجمان کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

کرتا ہے اللہ تعالیٰ انکی اور ہماری ہدایت فرمائے آمین۔ دارالعلوم اور مظاہر العلوم یا اُن کے بنیاد رکھنے والوں اور طلبا اور مدرسین کے متعلق ہر گمراہ اور مخالف اہل اسلام اور مخالف اہل سنت ایسے ہی الفاظ کہتا ہے۔"

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہٗ دارالعلوم دیوبند ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

المشتہر

مولوی سید شفیق الرحمن محلہ عالی کلاں سہارنپور

[illegible]

یہ اشتہار بازی بجائے خود اس نوعیت کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے سخت انقباض محسوس ہوتا ہے، اور ناظرین ترجمان القرآن گواہ ہیں کہ اس طرز کے اشتہارات اور اخبارات و رسائل کے مضامین سے کبھی ان صفحات میں تعرض نہیں کیا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بعض نادان مرید اور شاگرد اب ایسے اکابر کو اس میدان میں اتار لاتے ہیں جو اپنے علم و تقویٰ اور روحانی مشیخت کے لحاظ سے ہندستان و پاکستان کی مذہبی دنیا میں معتمد علیہ ہیں، اس لئے مجبوراً پچھلی اشاعت میں بھی ان کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی، اور اب اس اشاعت میں دوبارہ اس پر اظہار خیال کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں یہ آخری گزارشات ہیں۔ خدا کرے کہ اس کے بعد پھر ان صفحات کو اس طرز خاص کے پروپیگنڈے کی جوابدہی سے آلودہ کرنے کی نوبت نہ آسکے۔

(۱)

سب سے پہلی نمایاں چیز جو مولانا حسین احمد صاحب کے اس بیان میں نگاہ کو کھٹکتی ہے وہ ان کی زبان ہے جسے ممکن ہے مولانا خود اپنے شایان شان سمجھتے ہوں، مگر ہم ان کے ساتھ اتنا حسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ زبان ہمیں ان کے مرتبے سے فروتر نظر آتی ہے۔ کسی شخص یا گروہ سے اختلاف ہونا کوئی بُری بات نہیں ہے۔ سخت سے سخت اختلافات ہو سکتے ہیں اور سخت سے سخت اظہار رائے شریفانہ زبان میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ زبان، کہ جس سے اختلاف ہو اس کے خلاف ٹٹ پونجیے، کم بخت، بدبخت،

[illegible]

اور خبیث جیسے رکیک الفاظ استعمال کر ڈالے جائیں، ایک مہذب آدمی کے بھی شایان شان نہیں ہے کجا کہ ایک ایسا مرد بزرگ اس کو اختیار کرے جو اس برعظیم کی سب سے بڑی دینی درسگاہ کا مسند نشین ہے اور جس کی طرف ہزارہا آدمی تعلیم دین ہی کے لئے نہیں، تزکیۂ نفس کے لئے بھی رجوع کرتے ہیں۔ جب قوم کے مقتدا اور مربی و معلم اس طرح کی باتوں پر اتر آئیں تو بعید نہیں کہ ان سے اخلاق و تہذیب کا سبق لینے والے اصاغر آدمیت سے بالکل ہی عاری ہو جائیں اور اس قوم میں نام کو بھی ایک دوسرے کی عزت کا پاس باقی نہ رہ جائے۔

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا   فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

مولانا کو اگر یاد نہ ہو تو ہم انہیں یاد دلاتے ہیں کہ کسی وقت ہم نے بھی ان کے نظریۂ قومیت اور ان کی کانگریس سے موافقت پر تنقید کی ہے۔ وہ تنقید اب بھی ہماری کتابوں "مسئلہ قومیت"، اور "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ دوم" میں موجود ہے۔ وہ اور ان کے شاگرد اور مرید ہماری ان تنقیدی عبارات کو دیکھ کر خود رائے قائم فرمائیں کہ دونوں زبانوں میں کتنا فرق ہے۔ بالفرض اگر دس بارہ برس بعد اس کا بدلہ لینا ہی ضرور تھا تو جزاء سیئۃٍ سیئۃ مثلہا کے اصول پر لیا جا سکتا تھا۔ یہ تعدی آخر کس آئین کی رو سے حضرت کے لئے جائز ہو گئی؟

(۲)

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ افسوسناک ہے، وہ مولانا کی انتہائی غیر ذمہ دارانہ روش ہے جو انہوں نے دوسروں کے دین و اعتقاد پر اظہار رائے کرنے میں اختیار کی ہے۔ ان کے سامنے ایک مفروضہ سوال پیش نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک جماعت کا نام لے کر اس پر چند الزامات لگائے گئے تھے۔ "تنابزوا بالالقاب" سے قطع نظر "مودودیوں" اور "مودودیت" کے الفاظ سے جس جماعت کا ذکر کیا گیا ہے، مولانا اس سے بالکل ناواقف نہ تھے۔ ان کو خوب معلوم تھا کہ ہندوستان و پاکستان میں ہزارہا مسلمان اس سے وابستہ اور لاکھوں اس سے متاثر ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس جماعت کے خیالات کہیں چھپے ہوئے نہیں ہیں بلکہ لکھے لکھائے مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود ایک سائل نے جیسے کچھ بے سروپا

الزامات بغیر کسی حوالے اور ثبوت کے اُس پر لگا دیے اُن کو مولانا نے جُوں کا تُوں تسلیم کر لیا اور اُن پر ایک تند و تلخ جواب غالباً یہ جانتے ہوئے سائل کے حوالہ کر دیا کہ اس سوال و جواب کو ان کے اپنے معتقدین اشتہار بازی کے لئے استعمال کرنے والے ہیں۔ انہوں نے کوئی ضرورت یہ تحقیق کرنے کی نہیں سمجھی کہ جس گروہ کے متعلق یہ سوال کیا جا رہا ہے اُس نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے بزرگوں کے متعلق فی الواقع کیا لکھا ہے، کن الفاظ میں لکھا ہے، کس سیاق و سباق میں لکھا ہے، اور اس کی دوسری تحریرات کیا شہادت دیتی ہیں کہ وہ ان بزرگوں کے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ معلوم کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہ سمجھی کہ اس گروہ کے بعض اشخاص کی طرف منسوب کر کے جو باتیں سوال میں لکھی گئی ہیں وہ فی الواقع کس کی لکھی ہیں، اُس کی اس گروہ میں کیا حیثیت ہے، اور اس کی کسی بات کو پورے گروہ کے خیالات کی ترجمانی قرار دیا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ بالفرض اگر مولانا کے پاس اس گروہ کی مطبوعات پڑھنے کے لئے وقت نہ تھا، اور نہ بیان کردہ امور کی تحقیق ہی کے لئے وہ فرصت پاتے تھے، تو آخر کس طبیب نے مشورہ دیا تھا کہ حضرت اس معاملہ میں رائے ضرور دیں؟ میں پوچھتا ہوں، کیا مذہبی پیشوائی کی ایسی ذمہ دارانہ مسند پر بیٹھ کر ایک متقی عالم کی یہ روش ہونی چاہیئے؟ کیا تقویٰ اور دیانت اسی چیز کا نام ہے؟ کیا یہی وہ تزکیۂ نفس ہے جس سے حضرت خود بہرہ مند ہیں اور دوسروں کو بہرہ مند فرما رہے ہیں؟ کیا اس جواب کی تحریر کے وقت حضرت کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات یاد تھے کہ سباب المسلم فسوق وقتالہ کفر۔ المسلم علی المسلم حرام دمہ ومالہ وعرضہ؟ کیا یہ جواب لکھتے وقت حضرت نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچا تھا کہ ہمیں اور انہیں ایک وقت مرنا اور اپنے رب کی عدالت میں حاضر ہونا ہے، وہاں اگر سائل کے الزامات محض بہتان و افترا ثابت ہو گئے تو حضرت اس کی توثیق کی پاداش سے کیا دیکھیں گے؟

(۳)

مولانا اور اُن کے گروہ کے دوسرے حضرات جن کی تحریریں حال میں جماعت اسلامی کے خلاف شائع ہوئی ہیں، اس بات کو بالکل بھول گئے ہیں کہ کسی شخص یا گروہ کے عقیدہ و مسلک کے متعلق کوئی رائے قائم یا ظاہر کرنا دیانتہً اس وقت تک صحیح نہیں ہے جب تک کہ انصاف کے ساتھ اس کی تمام یا اکثر

تحریروں کو خود نہ پڑھ لیا جائے۔ کسی خدا ترس آدمی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ محض سنی سنائی باتوں پر دوسروں کو ضال اور مضل قرار دے بیٹھے، یا چند نیازمندوں کی پیش کی ہوئی نشان زدہ عبارتوں پر رائے قائم کرلے اور اسے شائع کر دے۔ یا پہلے کسی کی خبر لینے کا عزم کر لیا جائے اور پھر اس کی کتابیں اس غرض سے کھنگالی جائیں کہ کہاں اس کو مطعون کرنے اور اس پر الزام تراشنے کی کوئی گنجائش ملتی ہے، یا ایک شخص کی بعض عبارتوں سے ایسے معانی اور نتائج نکالے جائیں جن کی تردید خود اسی شخص کی بہت سی دوسری عبارتیں کر رہی ہوں۔ اس طرح کی حرکتیں وہ لوگ تو کر سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر صرف دنیا اور اس کی زندگی ہے، مگر جنہیں خدا اور آخرت کا بھی کچھ خیال ہو اُن سے ایسی حرکات بالکل خلاف توقع ہیں۔

ان حضرات کی وہ تمام تحریریں ہم نے بالاستیعاب پڑھی ہیں جو انہوں نے ہمارے خلاف لکھی ہیں۔ اُن کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد جو کچھ ہم نے پایا ہے وہ یہ ہے:۔

۱۔ بعض مقامات پر ہماری اصل عبارتیں نقل کرنے کے بجائے اپنے نکالے ہوئے نتائج اپنے الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں اور انہیں ہمارے سر تھوپ دیا گیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ یہ حرکت تمام ایسے مقامات پر کی گئی ہے جہاں الزام لگانے والے نے محسوس کیا کہ اگر وہ ہماری عبارت کو ہمارے الفاظ میں نقل کریگا تو اپنا الزام ثابت نہ کر سکے گا۔

۲۔ بعض مقامات پر ہمارے چند فقرے ایک مضمون سے نکال کر ان سے اپنے من مانے نتائج نکالے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر وہی مضمون پورا پڑھا جائے یا وہ کتاب پوری دیکھی جائے جس کے چند فقروں پر ان نتائج کی بنا رکھی گئی ہے تو اُس سے بالکل برعکس نتائج نکلتے ہیں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یا تو محض کسی کے دکھلائے ہوئے نشان زدہ فقرے مفتی صاحب نے ملاحظہ فرمالیے اور فتویٰ رسید کر دیا، یا پھر پورا مضمون پڑھنے کے باوجود دانستہ الزام تراشی فرمائی۔

۳۔ بعض مقامات پر ہماری عبارات میں کھلی کھلی تحریفیں کی گئی ہیں۔ کہیں آگے پیچھے اپنے الفاظ ملائے گئے ہیں اور کہیں ایک فقرے کو اُن فقروں سے الگ کیا گیا ہے جو اصل مدعا کو ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح کی تحریفات غالباً یہ سمجھتے ہوئے کی گئی ہیں کہ جن لوگوں کی نظر سے ہماری اصل مطبوعات گزری ہیں ان کی

نگاہ میں چاہے محرّف کی رتی برابر وقعت باقی نہ رہے۔ مگر بہت سے ناواقف لوگ تو دھوکا کھا ہی جائیں گے
۴۔ بعض مقامات پر ہماری عبارت تو صحیح نقل کی گئی ہے مگر ہمارا منشا سمجھنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی گئی اور خالص بدظنی کے ساتھ ہمارے الفاظ سے بالکل غلط معنی نکال لئے گئے، حالانکہ ہم سے پوچھا جائے تو ہم اپنے الفاظ کا صحیح محمل بتا سکتے ہیں اور اپنی دوسری تحریروں سے ثابت کر سکتے ہیں کہ ان لفظ سے ہمارا اصل مدعا کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک عبارت اگر دو یا زائد معنوں کی محتمل ہو تو معتبر صرف وہی معنی ہونگے جو خود مصنف بیان کرے اور جن کی شہادت اس کی دوسری عبارتیں دیں، نہ کہ وہ جو ایک معاند بیان کرے۔
۵۔ بعض مقامات پر کسی ماخذ اور حوالے کے بغیر ہماری طرف ایک عقیدہ یا مسلک یا جرم منسوب کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہم اس سے بارہا بالفاظ صریح براءت ظاہر کر چکے ہیں اور ہماری تحریروں سے ہرگز اُس الزام کا ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ہم حیران ہیں کہ یہ آخر دیانت کی کونسی قسم ہے کہ کسی کو زبردستی گمراہ، بدعقیدہ اور مجرم بنانے کی کوشش کی جائے درآنحالیکہ وہ بار بار اُس سے براءت ظاہر کر رہا ہو۔
۶۔ بعض مقامات پر ہمارے خلاف ایسے اعتراضات کئے گئے ہیں جن کے مدلّل جوابات ہماری تحریروں میں موجود ہیں۔ یہ اعتراض اگر اُن تحریروں کو پڑھے بغیر کئے گئے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان حضرات کو دوسروں پر اعتراض جڑنے کا بڑا شوق ہے مگر ان کے مسلک سے واقف ہونے کی تکلیف گوارا نہیں ہے۔ اور اگر جوابی دلائل سے واقف ہونے کے باوجود ان اعتراضات کو دہرایا گیا ہے اور جوابی دلائل سے تعرّض نہیں کیا گیا تو یہ صریح جھگڑالو ذہنیت کی علامت ہے۔
۷۔ بعض مقامات پر ہماری تحریک، یا ہمارے مسلک، یا کسی خاص معاملہ میں ہمارے نقطۂ نظر پر ایک جامع رائے کا اظہار کیا گیا ہے مگر اس کی تائید میں کوئی شہادت ہماری تحریروں سے پیش نہیں کی گئی، نہ یہ بتایا گیا کہ اس رائے کی بنیاد کیا ہے۔ اس طرح کی بے بنیاد رائے زنیاں کرنے پر اگر کوئی اتر آئے تو دنیا میں کون ہے جو اس کی رائے کی ضرب سے بچ سکتا ہو۔
۸۔ بعض مقامات پر ساری اعتراضی تقریر کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک ہم نے

کسی فقہی مسئلے کے بیان میں، یا کسی کلامی مسئلے کی تشریح میں کوئی غلطی کی ہے۔ لیکن اُسے بیان ایسے مبالغہ آمیز انداز سے کیا گیا ہے کہ گویا معاذ اللہ ہم نے سارے دین کو ہدم کر ڈالا ہے۔ حالانکہ نہ علمی مسائل میں غلطی کر جانا کوئی دنیا سے نرالا واقعہ ہے اور نہ ہر غلطی لازماً گمراہی ہوتی ہے۔

۹۔ بعض مقامات پر ایسے امور کو مخالفت اور فتوے بازی کی بنیاد بنایا گیا ہے جن میں اختلاف کی گنجائش ہے اور فریقین کے پاس اپنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں شرعی دلائل موجود ہیں۔ اس طرح کے اختلافی مسائل کو ایک علمی بحث کا موضوع تو بنایا جا سکتا ہے، مگر کسی معقول انسان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ ان کی بنیاد پر مخالفت کا طوفان اُٹھائے گا اور فتوے بازی پر اُتر آئے گا۔

یہ تجزیہ جو ہم نے ان حضرات کی مخالفانہ تحریروں کا کیا ہے اس کے ہر جزء کی نظیریں ہم ان کی تحریروں سے پیش کر سکتے ہیں۔ وہ جب چاہیں اس کے نظائر ان کی خدمت میں حاضر کر دیے جائیں گے۔ اس سے پہلے اشتراکی، قادیانی، منکرین حدیث، بریلوی اور مسلم لیگی حضرات اس طرح کی زیادتیاں ہم پر کرتے رہے ہیں۔ بعض مناظرہ باز اہل حدیث نے بھی یہ شیوہ اختیار کیے رکھا ہے۔ بعض اخبارات اور رسائل کا تو برسوں سے مستقل طریقہ ہی یہ رہا ہے کہ ان ہتھکنڈوں سے ہمارے خلاف رائے عام پیدا کریں۔ لیکن ہم کسی ایسے شخص کو قابل التفات نہیں سمجھتے جس کے طرز عمل میں حیا اور خوفِ خدا کے فقدان کی علامات پائی جاتی ہوں۔ دیوبند اور مظاہر العلوم کے ان اکابر کو ہم ابھی تک اس صف میں شامل نہیں سمجھتے۔ اُن سے یہ توقع باقی ہے کہ وہ اس حد تک اپنے آپ کو گرا ہوا ثابت نہ کریں گے۔ اسی لئے ہم نے ان پر اتنا وقت صرف کیا ہے۔ خدانخواستہ جس روز اس پہلو سے ہمیں مایوسی ہو گئی، اس کے بعد انشاء اللہ ان کے ہزار مضامین اور اُن کی لاکھ اشتہار بازیوں کا ایک جواب بھی ادھر سے سننے میں نہ آئے گا۔

(۴)

ہمارے لئے یہ بات سخت حیران کن ہے کہ ہماری مخالفت میں صرف علماء دیوبند ہی نہیں، دوسرے گروہوں کے علماء بھی جن باتوں کو بار بار چھانٹ چھانٹ اور اُچھال اُچھال کر سامنے لا رہے ہیں وہ قریب قریب سب کی سب ایسی ہیں جن کو ہم نے آج یا کبھی کسی بحث کے ضمن میں، یا کسی سوال کے جواب میں

لکھ دیا ہے۔ بلکہ بعض باتیں تو ایسی نکال نکال کر لائی جا رہی ہیں جو برسوں سے ترجمان القرآن کے پرانے فائلوں میں دبی پڑی تھیں اور خود ہمیں بھی یاد نہ تھیں کہ وہ ہمارے قلم سے نکلی ہیں۔ ان میں شاید کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کی ہم نے خاص طور پر تبلیغ کی ہو، یا جس کے ماننے کی لوگوں کو دعوت دی ہو، یا جس کو ہم نے بار بار دہرایا ہو۔ لیکن ہمارے یہ مخالف علماء اپنے فتووں اور مضامین اور اشتہارات میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ گویا ہمارا اوڑھنا بچھونا یہی مسائل ہیں، انہی کے ذکر و بیان میں ہم نے اپنی عمر کھپائی ہے اور انہی کو پھیلانے میں ہم رات دن لگے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس جن خیالات کو پھیلانے کی فی الواقع ہم برسوں سے کوشش کر رہے ہیں، جن چیزوں کو ہم نے بار بار لکھا اور کہا ہے، جن باتوں کو ماننے کی دنیا بھر کو دعوت دی ہے جس چیز کو قائم کرنے کی سعی میں ایک مدت دراز سے ہم اپنی جان کھپا رہے ہیں، اور جن چیزوں کو مٹانے کے لئے ہم نے اپنا سارا زور صرف کر دیا ہے، ان کا یا تو سرے سے ان حضرات کی تحریروں میں کہیں ذکر ہی موجود نہیں ہے، یا کبھی کبھار کسی نے "ہنرش نیز بگو" کی شرط پوری کرنے کے لئے ان کا ذکر کیا بھی ہے تو بس ایک اچٹتا ہوا اشارہ کر دیا ہے۔ کیا ان حضرات میں سے کوئی صاحب ذرا سی تکلیف فرما کر ہمیں بتائیں گے کہ اس انتخاب میں کیا حکمت پیش نظر ہے؟ قرآن سے جو اصول ہم نے سمجھا ہے وہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنے ان کاموں سے جانچا جاتا ہے جن کی اسے زیادہ فکر ہو اور جن میں وہ اکثر مشغول رہے۔ یہ غالب فکر اور اکثری مشغولیت اگر حق ہو تو کبھی کبھار کے غلط کام بلا توبہ بھی معاف ہو سکتے ہیں کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ۔ مگر یہ عجیب ماجرا ہے کہ ہمارے دور حاضر کے بزرگانِ دین ایک گروہ کے وقتی اور احیانی اور عارضی کاموں کو اس مقصد کے لئے چھانٹتے اور پکڑتے پھرتے ہیں کہ اس کی مستقل دعوت اور اس کے شب و روز کے مشغلے اور اس کی غالب فکر پر ان کے ذریعے سے پانی پھیر دیں۔ یہ حرکتیں دیکھ کر دل بے اختیار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے آخرت کی عدالت کے جملہ اختیارات اپنے ہی ہاتھ میں رکھے۔ اگر خدانخواستہ کچھ بھی اختیار ان حضرات کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہوتا تو نہ معلوم یہ کن ترازوؤں سے خلق خدا کو تولتے اور کیسی کیسی چھوٹی باتوں پر لوگوں کے عمر بھر کے اعمال حبط کر دیتے۔

ان حضرات کی خاص کوشش یہ ہے کہ ان باتوں کو کسی نہ کسی طرح ہمارے سر منڈھیں جن سے ہمارے

خلاف عوام کے جذبات بھڑک سکتے ہوں۔ مثلاً یہ کہ جماعت اسلامی والے عام مسلمانوں کی تکفیر کرتے ہیں، اپنے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں۔ گناہِ کبیرہ کے ارتکاب پر سلبِ ایمان کا حکم لگاتے ہیں، صحابۂ کرام کی توہین کرتے ہیں، بزرگانِ دین اور خصوصاً اکابرِ صوفیہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں، ان کا امیر مجدّد اور مہدی ہونے کا مدعی ہے اور آگے کچھ اور بننا چاہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان الزامات کے ثبوت فراہم کرنے میں جیسی کچھ محنت کی جا رہی ہے اور جس جانفشانی کے ساتھ ہزاروں صفحات کے مضامین میں سے لفظ لفظ چن کر ہمارے خیالات کا ایک ایسا مجموعہ تیار کیا جا رہا ہے جو خود ہمارے علم میں بھی پہلی مرتبہ انہی حضرات کے واسطے سے آتا ہے، وہ چاہے کسی اور کی نگاہ سے مخفی ہو، مگر ہماری نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہم اس کمالِ فن کی داد تو ضرور دیتے ہیں، کیونکہ ہم ہر کمالِ فن کے قدر شناس ہیں، خواہ وہ نقب زنی و جیب تراشی کا ہی کمال کیوں نہ ہو، مگر معلوم صرف یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی دنیا اور عاقبت سنوارنے کی فکر چھوڑ کر آخر اس کام میں یہ عرق ریزی کس لئے کی جا رہی ہے؟ اور یہ اصولِ قرآن، حدیث، یا طریقِ سلف میں کہاں سے اخذ کیا گیا ہے کہ تم ضرور ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو مطعون کرنے کے وجوہ تلاش کرو اور پھر بھی کام نہ چلے تو اپنی طرف سے کچھ ملا کر فردِ جرم مکمل کرو؟

(۵)

ایک اور بات جو ہمارے لئے اس سے کچھ کم حیران کن نہیں ہے وہ ہمارے معاملہ میں بعض اکابر کے نقطۂ نظر کا تغیّر ہے جو پچھلے چند برس میں رونما ہوا ہے، حالانکہ ہمارے خیالات برسوں پہلے جو کچھ تھے وہی آج ہیں، اور ہماری وہ تحریریں جن پر آج ہم ضالّ اور مُضلّ، بلکہ بدبخت اور خبیث تک ٹھیرائے جا رہے ہیں اُس وقت سے بہت پہلے شائع ہو چکی تھیں جبکہ ان بزرگوں کی نگاہ میں ہم کم از کم ضالّ اور مُضلّ تو نہ تھے۔

۱۹۴۵ء کے آغاز میں انجمن اصلاح المقربی، دیوانہ آباد، ضلع لائل پور سے جناب مولانا کفایت اللہ صاحب کی خدمت میں ہمارے متعلق ایک استفسار بھیجا گیا تھا۔ اس کا جو جواب مولانا کی طرف سے وصول ہوا اس کے الفاظ یہ تھے:-

”مودودی صاحب کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی اور گمراہی نہیں ہے۔ صرف یہ بات محلِ غور ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس تحریک کے مفید و بارآور

ہونے کے لئے ظروف مساعد ہیں یا نہیں - اور یہ کہ تحریک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال"

ایک اور صاحب نے ضلع بارہ بنکی سے اُسی زمانہ میں مولانا کی خدمت میں جماعت اسلامی کے متعلق ایک سوال بھیجا تھا جس کا یہ جواب آیا تھا :-

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نظریہ اصولاً تو صحیح ہے مگر آج کل عملی نہیں ہے جیسے کوئی کہے کہ حدودِ شرعیہ جاری ہونی چاہئیں - یہ بات اصولاً تو صحیح ہے مگر اس زمانہ میں قطع ید سارق پر اور رجم زانی پر جاری کرنا عملاً ممکن نہیں ہے کیونکہ غیر اسلامی حکومت حائل ہے تاہم اگر کوئی ان کی جماعت میں داخل ہو کر حسبِ استطاعت اسلامی خدمت کرے تو مضائقہ نہیں ہے"

آج وہی مولانا کفایت اللہ صاحب ایک دوسرا فتویٰ صادر فرماتے ہیں جو سہارنپور کے شائع شدہ ایک اشتہار میں یوں درج ہے :-

"مودودی جماعت کے افسر مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کو میں جانتا ہوں - وہ کسی معتبر اور متقی عالم کے شاگرد اور فیض یافتہ نہیں ہیں - اگرچہ ان کی نظر اپنے مطالعہ کی وسعت کے لحاظ سے وسیع ہے تاہم دینی رجحان ضعیف ہے ، اجتہادی شان نمایاں ہے ، اور اسی وجہ سے ان کے مضامین میں بڑے بڑے علماءِ اعلام بلکہ صحابۂ کرام پر بھی اعتراضات ہیں - اس لئے مسلمانوں کو اس تحریک سے علیحدہ رہنا چاہئے اور ان سے میل جول ، ربط و اتحاد نہ رکھنا چاہئے - ان کے مضامین بظاہر دلکش اور اچھے معلوم ہوتے ہیں ، مگر ان میں ہی وہ باتیں دل میں بیٹھتی جاتی ہیں جو طبیعت کو آزاد کر دیتی ہیں اور بزرگانِ اسلام سے بدظن بنا دیتی ہیں"

اسی ۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں مولانا حسین احمد صاحب سے جماعت اسلامی کی دعوت کے متعلق سوال کیا گیا تھا اور اس کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا :-

"مولانا مودودی کا نظریہ بہت سی تحریروں میں اور رسالوں وغیرہ میں شائع ہوتا رہا ہے - مجھ کو اس قدر فرصت نہیں ہے کہ بالاستیعاب دیکھوں - جس قدر مضامین نظر سے گزرے ہیں ، حالاتِ موجودہ میں ناممکن العمل ہیں ، واللہ اعلم

میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ موجودہ دور میں اور اس ماحول میں کیا شرعی تکلیف ہم پر ان امور پر حسب تصریحات عائد ہوتی ہے یا نہیں "

ایک اور صاحب نے جو اس وقت فیروز پور جھرکہ میں نائب تحصیلدار تھے، جماعت کی تمام مطبوعات مولانا کو بھیجی تھیں اور ان سے درخواست کی تھی کہ انہیں ملاحظہ فرما کر یہ بتائیں کہ جمعیت علماء ہند کے مسلک اور جماعت اسلامی کی دعوت میں سے کون حق پر ہے۔ نیز خصوصیت کے ساتھ "ایک اہم استفتا" کی طرف توجہ دلا کر پوچھا تھا کہ اس پمفلٹ کو پڑھ کر میرا دل اپنی ملازمت سے اچاٹ ہو گیا ہے۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔ اس کا جو جواب حسین آباد ضلع مظفر نگر سے مولانا کے اپنے قلم کا لکھا ہوا (مورخہ ۳۰ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ) وصول ہوا اس کے الفاظ یہ تھے:۔

" محترما! میں اس قدر مصروف اور عدیم الفرصت ہوں کہ روزانہ ڈاک کا دیکھ لینا بھی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ کتابوں کا دیکھنا اور جواب لکھنا۔ مودودی صاحب فارغ ہیں، جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں چھپوا دیتے ہیں۔ جمعیت العلماء نے جو طریقہ سیاسیات میں اختیار کیا ہے وہ حسب استطاعت اَہْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن کی بنا پر ہے۔ موجودہ گرد و پیش میں جو طاقت اور قدرت موجود ہے اسی پر اس کی حرکت و سکون کا مدار ہے۔ مودودی صاحب جو فلسفہ پیش فرما رہے ہیں اس کے دیکھنے اور اس پر تنقید و تبصرہ کرنے یا اس کا جواب لکھنے کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور اگر آتی بھی تو مہلت نہیں ہے۔ مودودی صاحب اور ان کے موافقین اپنے عمل کو حرکت میں لائیں۔ ہم ان کا مقابلہ نہ کریں گے اور نہ کوئی محاذ قائم کریں گے۔ اگر ہماری سمجھ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہی عمل شرعی اور مفید سمجھ میں آیا تو ہم بھی متبع بن جائیں گے ورنہ حسب قاعدۂ قرآنیہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا ہم عنداللہ معذور ہیں۔

دوسری چیز آپ نے اپنی ملازمت کے متعلق پوچھی ہے۔ میں جہاں تک سمجھا ہوں آپ کو جبکہ دوسرا طریقہ اکل حلال میسر ہے تو آپ کو اس ملازمت کو چھوڑ ہی دینا چاہئے اگرچہ وہ "اہم استفتا" میری نظر سے نہیں گذرا مگر جو مضمون آپ نے اس کا ذکر فرمایا ہے اقرب الی الصواب

ہے۔ آپ کے احباب کا حکم میری سمجھ میں نہیں آتا اگرچہ وہ علماء ہیں"۔

آج ٹھیک پانچ برس بعد ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ میں وہی مولانا حسین احمد صاحب ہمارے متعلق اُس رائے کا اظہار فرماتے ہیں جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس انقلاب رائے اور اس تغیرِ فکر و نظر کی علت کیا ہے؟ اگر اُس وقت سے اب تک کچھ نئی گمراہیاں ہم سے مزید ہو گئی ہیں جن سے اُس وقت تک ہمارا دامن پاک تھا، تو ازراہِ عنایت ضرور ہمیں اس سے آگاہ فرمایا جائے یا اگر اب اِن حضرات کو اُن کتابوں کے پڑھنے کی فرصت مل گئی ہے جنہیں اُس وقت نہ پڑھا تھا، اور بالاستیعاب ان کا مطالعہ فرما کر وہ ہماری گمراہیوں پر آج مطلع ہوئے ہیں، تو کم از کم یہی بات بصراحت ارشاد فرما دی جائے۔ اور اگر بات یہ نہیں ہے بلکہ یہ سارے فتوے اور مضامین اب اس لئے برسنے شروع ہوئے ہیں کہ جماعت اسلامی کی بڑھتی ہوئی تحریک سے اپنے حلقۂ اثر کے آدمیوں کے ٹوٹنے کا اندیشہ ان بزرگوں کو لاحق ہو گیا ہے، اور ساری فکر انہیں اب ان ٹوٹنے والوں کو روکنے کی ہے —— وہی فکر جس نے اشتراکیوں، مسلم لیگیوں، بریلویوں، قادیانیوں، اہل حدیث اور منکرین حدیث کو ہماری مخالفت میں متحرک کر رکھا ہے —— تو گستاخی معاف، یہ اندازِ فکر اہلِ حق کو زیب نہیں دیتا اور نہ یہ ہتھکنڈے ان کے شایانِ شان ہیں۔ یہ تو دوکانداروں کے سوچنے کا انداز ہے کہ مقابل کی دوکان اُن کے گاہکوں اور اسامیوں کو توڑنے نہ پائے، اور شاید کوئی شریف دوکاندار بھی، اگر تھوڑی سی خدا ترسی اُس میں ہو، اس حد تک گرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا کہ محض گاہک بچانے کے لئے حریف دوکاندار کے مال میں کیڑے ڈالنے لگے۔ بہر حال اپنی پوزیشن مشخص کرنا اِن حضرات کا اپنا کام ہے۔ رہے ہم، تو الحمدللہ کہ ہم دوکاندار نہیں ہیں نہ کسی کے حریفِ تجارت ہیں۔ جس چیز کو ہم نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے حق پایا ہے اسے خلق اللہ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جسے حق معلوم ہو، قبول کرے، اس کا اپنا بھلا ہے۔ جسے حق نہ معلوم ہو، رد کر دے۔ اس کا معاملہ اُس کے خدا سے ہے۔ ساری دنیا اسے قبول کرے تو بجز آخرت کی منفعت کے ہمیں کوئی اجر اس سے مطلوب نہیں۔ اور اگر ساری دنیا اسے رد کر دے تو ہمارا اس سے کوئی نقصان نہیں۔

(۶)

آخر میں ہم تمام ان علماء سے جو اپنے آپ کو اہلِ حق میں سے سمجھتے ہوں ، اور جن کو فی الواقع دنیا کے ساتھ آخرت کی بھی کچھ فکر ہو تین باتیں صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں ۔

اوّل یہ کہ ہم اس وقت فسق و ضلالت کی اُس حکمرانی کو مٹانے کے درپے ہیں جو علوم و افکار پر، اخلاق و معاشرت پر، تہذیب و تمدن پر اور معیشت و سیاست پر قائم ہے، اور ہماری تمام کوششیں اس کام کے لئے وقف ہیں کہ زندگی کے ان تمام شعبوں پر خدا کے دین کی حکمرانی قائم ہو۔ آپ حضرات اگر کچھ بھی توسّم کی صلاحیت رکھتے ہیں تو کھلے کھلے آثار آپ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ دین کی حمایت میں اس وقت وہ کونسی مستعد اور منظم طاقت ہے جس کو فسق و ضلالت کی ساری طاقتیں اپنا اصل حریف سمجھ رہی ہیں اور کس کے خلاف انہوں نے اپنا پورا زور لگا رکھا ہے ۔ اشتراکیوں سے پوچھئے کہ علماء کے پورے گروہ کو آپ اپنے لئے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں یا جماعتِ اسلامی کو؟ منکرینِ حدیث کی اپنی تحریروں میں دیکھ لیجئے کہ اہلِ حدیث اور دوسرے تمام حامیانِ حدیث کے خلاف اُن کا غصہ زیادہ بھڑکا ہوا ہے یا جماعتِ اسلامی کے خلاف؟ قادیانیوں کے اپنے اخبارات و رسائل آپ کو بتا دیں گے کہ ان کو جماعتِ اسلامی کا زیادہ خوف لاحق ہے یا اپنے دوسرے مخالفین کا؟ مغربیت کے علمبرداروں کی تحریریں اور تقریریں اور عملی تدبیریں آپ کے سامنے خود شہادت دیں گی کہ وہ زیادہ پریشان جماعتِ اسلامی سے ہیں یا باقی ماندہ پورے مذہبی طبقے سے؟ اس وقت میں جبکہ ان طاقتوں سے ہماری کشمکش برپا ہے، آپ کو خوب سوچ لینا چاہئے کہ آپ کا وزن کس پلڑے کی طرف جا رہا ہے ۔ آپ لڑنا چاہیں تو شوق سے لڑیں ۔ مگر اپنا انجام سوچ لیں ۔ اگر خدا کے ہاں آپ سے باز پرس ہوئی اور پوچھا گیا کہ جب طاعت اور فسق ، اور ہدایت اور ضلالت کے درمیان معرکہ برپا تھا تو تم نے کس کو کس پر ترجیح دی تھی ، اس وقت آپ کیا جواب دیں گے ؟ اُس وقت آپ اپنے یہ فتوے اور یہ مضامین اور یہ اعتراضات حجت میں پیش کر کے بچ نکلنے کی توقع رکھتے ہوں ، اور آپ کو امید ہو کہ ہماری خطائیں اور لغزشیں گنا کر آپ ثابت کر سکیں گے کہ اس معرکہ کے فریقین میں دراصل گشتنی و گردن زدنی ہم ہی تھے ، تو بسم اللہ ، اپنی یہ مہم جاری رکھیے

اور کچھ کسر ابھی باقی رہ گئی ہو تو اسے بھی پورا کر ڈالیے۔

دوم یہ کہ اگر فی الحقیقت آپ میں سے کوئی نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ دیانت داری کی بنا پر ہم سے ناراض ہے تو اس کو چاہئے کہ زبان کھولنے سے پہلے اطمینان کے ساتھ ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرکے اِس معاملہ میں ایک جچی تلی رائے قائم کرے کہ آیا ہماری حیثیت ایک ایسے گروہ کی ہے جس سے صرف اختلاف کیا جاسکتا ہے، یا ایسے گروہ کی جس کی مخالفت بھی کرنی ضروری ہے، یا ایسے گروہ کی جو مذکورۂ بالا معرکہ کے فریقین میں سے اِس بات کے لئے احق ہے کہ آپ اس کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں؟ چونکہ اس وقت کشمکش برپا ہے اور یہ ایک قطعی فیصلہ پر پہنچے بغیر ختم ہونے والی نہیں ہے، اس لئے آپ کو متفرق مسائل پر اپنی اعتراضی تقریریں مرتب کرنے سے پہلے یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا اپنی تمام کردہ و ناکردہ خطاؤں کے باوجود ہم اُن لوگوں کی بہ نسبت آپ حضرات کے لئے زیادہ قابل برداشت ہیں جو یہاں فسق و ضلالت پھیلا رہے ہیں، یا ہم ایسے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں کہ ہمارے مقابلہ میں اشتراکی، قادیانی، منکرین حدیث، اور فرنگیت کے علمبردار، سب کو آپ برداشت کر سکتے ہیں؟

سوم یہ کہ ہمارا ہمیشہ سے یہ اعلان ہے اور آج بھی ہم اس پر قائم ہیں کہ ہماری جس بات کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ثابت کر دیا جائے ہم بلا تامل اس سے رجوع کریں گے۔ اب اگر ہم سے اختلاف رکھنے والے حضرات محض فتنہ پردازی نہیں چاہتے بلکہ اختلافات کا تصفیہ چاہتے ہیں تو ان کے لئے صحیح راستہ یہ نہیں ہے کہ اشتہار بازی کریں یا مخالفانہ پراپیگنڈے پر اُتر آئیں، بلکہ صحیح راستہ یہ ہے اور یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ انہیں ہم پر جتنے بھی اعتراضات ہوں وہ انہیں یکجا مبرہن لکھ کر ہمارے پاس بھیج دیں۔ ہم انشاء اللہ ان کی تحریر کو ان صفحات میں لفظ بلفظ درج کر دیں گے اور اپنے جوابات سے ان کو مطمئن کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یا اگر وہ خود اپنے ہی کسی اخبار اور رسالے میں اپنے اعتراضات شائع کرنا پسند فرمائیں تو ہم اِس شرط کے ساتھ ان کا جواب دینے کے لئے تیار ہیں کہ اوّل تو وہ آئے دن کی طعنہ زنی بند کر کے اپنے جملہ اعتراضات بیک وقت مرتب فرما دیں، دوسرے یہ کہ وہ اس بات پر راضی ہوں کہ جس طرح ہم ان کے اعتراضات کو لفظ بلفظ نقل کر کے ان کا جواب دیں گے اسی طرح

وہ بھی ہمارے جواب کو اپنے ہاں لفظ بلفظ نقل کر کے پھر جو چاہیں اس پر خامہ فرسائی کریں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۰۳)

اس دور کو اہل تاریخ نے "پرانک دور" کا نام دیا ہے جس میں ویدا ور گوتم بدھ کی تعلیم کے بجائے پرانوں کی تعلیم پر عمل شروع ہو گیا تھا۔ یہ دور بدھ ازم کے دور تنزل سے مسلمانوں کے داخلۂ ہند تک جاری رہا، مؤرخین کا اتفاق ہے کہ یہ دور قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک دور تھا، اس عہد میں بت پرستی اوج کمال کو پہنچ گئی۔ مندر اور عبادت گاہیں زنا و فحش کاری کے اڈے بن گئیں اور مندر کے پجاری ایسے اخلاق سوز اعمال کا ارتکاب کرنے لگے کہ ان کے تصور ہی سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ غرض ہندوستان میں ہندوؤں کی دینی اور اخلاقی حالت بھی اس انتہائی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ ان کی اصلاح کی کوئی توقع نہ رہی تھی۔ (باقی)

ایک تنبیہ

ایک فاضل دوست نے تنبیہ کیا ہے کہ ترجمان کے پچھلے شمارہ کے ص ۲۹ پر ارادلنا بادی الرائے کا ترجمہ "حقیر اور رذالے لوگ" کیا گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ یہ تنبیہ بالکل درست ہے اور میں اس کے لئے شکر گذار ہوں۔ لیکن میں نے یہ ترجمہ نہیں کیا تھا بلکہ حکیم عبدالرشید محمود صاحب نے ہم لوگوں کیلئے "رذالے لوگ" کا جو لفظ استعمال کیا تھا میں نے "بادی الرائے" کے لفظ کے اندر اس کی جھلک دکھائی تھی کہ یہ دونوں الفاظ ایک ہی قسم کے ذہن سے تراش ہوئے ہیں اور معاملہ کے اس پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے حکیم صاحب قبلہ کے الفاظ واوین کے اندر دیئے تھے تاکہ ناظرین پر واضح ہو سکے کہ

این دو شمع اند کہ از یکدگر افروختہ اند

امید ہے اس سے کسی صاحب کو غلط فہمی نہیں ہوگی — امین احسن (اصلاحی)

رسائل و مسائل

"قانونِ حجاب کے لحاظ سے بُرقع کا جواز و عدمِ جواز"

سوال:

احقر ایک مدت سے ذہنی اور قلبی طور پر آپ کی تحریک اقامتِ دین سے وابستہ ہے۔ پردہ کے مسئلہ پر آپ کے افکارِ عالیہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن آخر میں آپ نے مروجہ بُرقع کو بھی Defend کیا ہے۔ اس کے متعلق دو ایک باتیں دل میں کھٹکتی ہیں۔ براہ مہربانی ان پر روشنی ڈال کر مشکور فرمائیں۔

پردے کی غایت صنفی میلان کی انتشار پسندی کو روکنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میلان ہر دو اصناف میں پایا جاتا ہے (گو دونوں میں فرق کی نوعیت سے انکار نہیں) اسی وجہ سے پردے کی اصل روح — غضِ بصر — کا حکم مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ برقع کی "دیوار" کے پیچھے عورتوں کی بہت بڑی اکثریت "نگاہ کے زنا" کی مرتکب ہوتی رہتی ہے۔ اس کی وجہ اکثر یہ Satisfaction ہوتی ہے کہ ہم تو مردوں کو دیکھ رہی ہیں لیکن مرد ہمیں نہیں دیکھ رہے۔ اور نہ ہماری اس "نظارہ بازی" کا علم ہی کسی کو ہے۔ سو اس طرح کی خواتین میں جوہرِ حیا — صنفِ نازک کا اصل جوہر — بہت کم ہو جاتا ہے۔

علاوہ ازیں برقع اوڑھ کر ایک اوسط معاشی وسائل کے کنبہ کی عورتیں اپنے کام کاج بھی کما حقہٗ انجام نہیں دے سکتیں۔ سفر ہی کو لیجئے، گاڑیوں اور بسوں وغیرہ میں چڑھنا اور اترنا برقع پوش عورت کے لئے خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔

پردہ — "مکمل پردہ" — کی اہمیت و معقولیت سے قطعاً انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ مروجہ برقع کے بجائے اور کوئی موزوں تر طریقہ استعمال ہو۔ مثال کے طور پر آج

سے چند سال پیشتر تک دیہات کی شریف عورتیں خود کو ایک چادر میں مستور کرتی تھیں۔ چادر میں وہ یہ جرأت نہ کر سکتی تھیں کہ کسی مرد کو مسلسل دیکھیں اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا کا بہت اعلیٰ مظاہرہ ہوتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ برقع کی نسبت اس چادر میں بہت اچھی طرح "پردہ" ہوتا تھا۔

آپ کی مصروفیات کے علم کے باوجود آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔

جواب:

آپ نے اپنے سوال میں کئی چیزوں کو خلط ملط کر دیا ہے۔ بہتر ہو کہ ایک ایک چیز کو آپ الگ الگ لیں اور پھر اس پر غور کر کے رائے قائم کریں۔ پہلی بات غور طلب یہ ہے کہ کیا غضِ بصر کی تلقین اور اخلاقی تربیت کے بغیر یہ ممکن ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کو گھورنے سے روکی جا سکے؟ آپ برقع کی نقاب پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ صرف مرد کو عورت پر نگاہ ڈالنے سے روکتی ہے، عورت کو اس ناجائز نظر بازی سے نہیں روکتی۔ مگر یہ عیب تو صرف نقاب میں نہیں ہے، چادر میں بھی ہے۔ شریعت اس کی اجازت دیتی ہے کہ عورت چادر سے منہ ڈھانک کر جب باہر نکلے تو اسے راستہ دیکھنے کے لئے کم از کم اتنی جگہ کھلی رکھنی چاہئے کہ اس کی آنکھ سامنے دیکھ سکے۔ پھر یہ عیب چلمن میں بھی ہے جو آپ دروازوں اور کھڑکیوں پر ڈالتے ہیں۔ بلکہ یہ عیب ہر اس چیز میں ہے جس سے کوئی عورت باہر جھانک سکتی ہو۔ آپ خود بتائیں کہ ان منافذ کو آپ کیسے روک سکتے ہیں؟ اور کیا فی الواقع شریعت کا بھی یہ مطالبہ ہے کہ ان سب منافذ کو روکا جائے؟

اسی کتاب پردہ میں میں نے وہ روایت نقل کی ہے جس میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت عائشہ کو حبشیوں کے کھیل کا تماشہ دکھایا تھا۔ وہاں میں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ مردوں کا عورتوں کو دیکھنا اور عورتوں کا مردوں کو دیکھنا نہ شرعاً بالکل یکساں ہے اور نہ نفسیات کے اعتبار سے ان کی حیثیت برابر ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر برقع بجائے خود بھڑکیلا اور جاذب نظر نہ ہو، سادہ ... بے زینت ہو تو شرعاً اس پر کس اعتراض کی گنجائش ہے؛ کیا وہ شریعت کے کسی مطالبہ کو پورا نہیں کرتا؟ اگر کرتا ہے

تو ہمارے پاس اس کے ناجائز ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے نزدیک کوئی دوسری چیز اس سے بہتر طریقہ پر شریعت کے منشا کو پورا کرتی ہو۔ ایسی کوئی چیز آپ کی نگاہ میں ہے تو آپ اسے تجویز کرسکتے ہیں، مگر بُرقع کو ناجائز کہنا کسی طرح درست نہیں۔

بُرقع اوڑھ کر چلنے پھرنے اور بسوں وغیرہ پر چڑھنے کے سلسلے میں آپ جو مشکلات بیان کرتے ہیں وہ جواز و عدمِ جواز کی بحث سے غیر متعلق ہیں۔ آپ کے نزدیک چادر میں اس سے کم مشکلات ہیں یا کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں تو خواتین کو اس کی طرف توجہ دلائیں، وہ تجربہ سے اُسے مناسب پائیں گی تو کیوں نہ اختیار کریں گی!

اسلام کے قانونِ اراضی پر چند سوالات

سوال:

ایک مقامی عالم نے جماعت کا منشور پڑھ کر دو سوالات کئے ہیں۔ ان کا جواب عنایت فرمایا جائے:۔

۱۔ زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں جاگیروں کی واپسی میں واجبی حدود سے زائد واپس لینے کی دلیل بیان فرمائیں، جبکہ حضرت زبیرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے اور چابک کی جولانگاہ تک کی زمین دی تھی۔

۲۔ بے دخلیٔ مزارعین کے سلسلہ میں یہ تو واضح ہے کہ فصل کی برداشت سے پہلے بے دخلی نہیں ہوسکتی لیکن اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ بے دخلی روکی جائے۔ اگر کوئی اور صورت ہو تو مع دلیل بیان کریں۔

ایک دوسرے عالم نے یہ سوال بھی کیا ہے کہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی نعمتوں سے ہر فرد بشر کو منتفع ہونا چاہئے۔ اب انتفاع عامہ کے لئے اگر ملکیتوں کو نظام حکومت کے سپرد کردیا جائے تو یہ قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے۔

جواب :-

۱- پہلے سوال کے سلسلے میں یہ بات اصولی طور پر جان لینے کی ہے کہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر جاگیرداروں کے حقوقِ ملکیت اس طرح قائم نہیں ہو جاتے جس طرح کسی شخص کو اپنی زرخرید املاک یا موروثی ملکیتوں پر حاصل ہوتے ہیں۔ جاگیروں کے معاملہ میں حکومت کو ہر وقت نظرثانی کرنے کا حق حاصل ہے، اور کسی عطیہ کو نامناسب پا کر حکومت منسوخ بھی کر سکتی ہے اور اس میں ترمیم بھی کر سکتی ہے۔

اس کی کئی نظیریں احادیث و آثار میں موجود ہیں۔ ابیض بن حمال مازنی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مآرب میں ایک ایسی زمین دی جس سے نمک نکلتا تھا۔ بعد میں جب لوگوں نے حضورؐ کو توجہ دلائی کہ وہ تو نمک کی بڑی کان ہے تو آپ نے اسے اجتماعی مفاد کے خلاف پا کر اپنا عطیہ منسوخ فرما دیا۔ اس سے صرف یہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ سرکاری عطایا پر نظرثانی کی جا سکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو حدِ اعتدال سے زیادہ دے دینا اجتماعی مفاد کے خلاف ہے، اور اگر ایسا عطیہ دیا جا چکا ہو تو اس پر نظرثانی کرنی چاہئے۔ یہی بات اُس روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں ذکر آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ کو ایک زمین کے عطیہ کا فرمان لکھ دیا اور فرمایا کہ اس پر فلاں فلاں اصحاب کی شہادت ثبت کرا لو جن میں سے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے۔ جب حضرت طلحہؓ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو آپ نے اس پر اپنی مہر لگانے سے انکار کر دیا اور کہا "آھذا کلہ لک دون الناس؟" کیا اتنی ساری زمین دوسروں کو چھوڑ کر تنہا تم اکیلے کو دے دی جائے؟ (ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۲۷۵-۲۷۶)

۔ با حضرت زبیرؓ کا معاملہ، تو جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زمین ان کو دی ہے اس وقت بے حساب زمینیں غیر آباد پڑی تھیں اور حضورؐ کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح ان کو آباد کیا جائے، اس لئے آپؐ نے اس زمانہ میں بکثرت لوگوں کو افتادہ اراضی کے بڑے بڑے رقبے عطا فرمائے تھے۔

۲- بے دخلی کے متعلق حکومت ایسا قانون بنانے کی مجاز ہے کہ کوئی مالک کسی مزارع کو معقول

وجہ کے بغیر بے دخل نہ کرسکے۔ اس کے ناجائز ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اگر کوئی نص اسمیں مانع نہیں ہے تو پھر یہ اجازت امام کے اُن اختیارات میں آپ سے آپ شامل ہے جو اسے لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے اور اجتماعی فتنوں کی روک تھام کرنے کے لئے مصالح عامّہ کی خاطر دیئے گئے ہیں۔ اِس وقت جبکہ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت کا مدار زندگی کلیتہً زمین پر ہے، مالکوں کو یہ کھلا ہوا اختیار دے دینا کسی طرح بھی مصلحتِ عامّہ کے مطابق نہیں ہے کہ وہ جب جس کاشت کار کو چاہیں بغیر کسی معقول وجہ کے اپنی زمین سے بے دخل کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کہیں کوئی کاشتکار اطمینان سے نہ بیٹھ سکے اور لاکھوں زراعت پیشہ لوگوں کی زندگی ہر وقت معلق رہے۔

۳۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ عجیب و غریب نتیجہ جو اخذ کیا گیا ہے اس کے متعلق مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوگی کہ آخر قرآن کے کونسے مقامات اس کے ماخذ ہیں؟ احتیاطاً آپ میری کتاب مسئلہ ملکیتِ زمین کے پہلے دو باب ان عالم صاحب کی خدمت میں پیش فرما دیں تاکہ وہ اُن باتوں کو نہ دُہرائیں جن کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے، یا اگر انہیں دہرائیں تو کم از کم یہ بھی ساتھ ساتھ بتا دیں کہ میرے جواب کے کن پہلوؤں سے وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ اس طرح میرا وقت بھی بچ جائے گا اور اُن کا وقت بھی۔

دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں شادی بیاہ کے تعلقات

سوال:۔

الجہاد فی الاسلام کے دوران مطالعہ میں ایک آیت والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیٍٔ الخ نظر سے گذری۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا نے تحریر فرمایا ہے کہ "اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے مالکم من ولایتھم من شیٍٔ سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے، نہ وہ باہم رشتہ قائم کرسکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کا ورثہ و ترکہ

مل سکتا ہے۔"

اب عرض یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان "دارالکفر" اور "دارالاسلام" کی صورت میں دو ملک وجود میں آگئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بھی اظہر من الشمس ہے۔ ان کی ذہنیتیں بھی بڑی حد تک بدل چکی ہیں، غرضیکہ ان سب لوازمات سے لیس ہو چکے ہیں جو ایک غلام قوم کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ بہتیرے رہنے پر مجبور ہیں اور بہت سے وہاں کی رہائش عمداً قبول کئے ہوئے ہیں بعض ہجرت کر کے اپنے دین و ناموس کی حفاظت کی خاطر پاکستان چلے آئے ہیں۔ ان میں اکثر ایسے بھی ہیں جن کے والدین ہندوستان ہی میں رہنا پسند کرتے ہیں اور مرتے دم تک اس کو چھوڑنے پر تیار نہیں مگر اولاد پاکستان چلی آئی ہے اور اب ہندوستان کی سکونت اختیار کرنے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں۔

اندریں حالات حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

(۱) ایسی حالت میں اولاد، والدین یا کسی اور رشتہ دار کے ورثہ و ترکہ سے محروم رہے گی؟ اگر وہ ان کے انتقال پر اپنے حق وراثت کا دعویٰ کریں تو کس حد تک یہ دعویٰ جائز یا ناجائز ہوگا؟

(۲) موجودہ حالات کے پیش نظر کوئی پاکستانی (مہاجر یا اصلی باشندہ) ہندوستانی مسلمان لڑکی سے شادی کر سکتا ہے یا نہیں؟ کرنے کی صورت میں تعلقات جائز سمجھے جائیں گے یا ناجائز؟

جواب:

جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا ان مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتہ دار دارالکفر میں رہ گئے ہیں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں تو ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتہ دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔ نکاح کے بارے میں میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہجرت سے نکاح آپ ہی آپ تو نہیں ٹوٹ سکتا لیکن اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہے اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جا سکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان ہو جانے

مطبوعات

اصولِ دعوتِ اسلام

مؤلفہ: مولانا محمد طیب صاحب قاسمی، مہتمم دارالعلوم دیوبند (انڈیا)
شائع کردہ: ادارۂ دعوت الحق، غریب خانہ، گوشہ محل روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

قیمت: ایک روپیہ دو آنہ - جلد معمولی۔

فاضل مؤلف کے دینی علم و فضل سے کون متعارف نہ ہوگا۔ موصوف کا یہ رسالہ تبلیغ کی حقیقت اور اس کے مقتضیات اور اس کی حکمت پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ بحث اپنے تمام ضروری پہلوؤں کے ساتھ بہت سے عنوانات کے تحت مرتب کی گئی ہے۔ کتاب کے فکری پس منظر میں مولانا محمد الیاس مرحوم کی تبلیغی تحریک کارفرما ہے۔

مبلغ کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ اس کا کلام تعریض و تلمیح سے پاک ہو (صفحہ ۵) اور بطورِ دلیل یہ حدیث نقل کی گئی ہے کہ "بشرا ولا تنفرا ویسرا ولا تعسرا وتطاوعا ولا تختلفا" مگر کیا فرماتے ہیں مولانا اس بارے میں کہ مبلغ کو تکفیر کے اختیارات کس حد تک حاصل ہیں؟ یہ چیز تو "ولا تنفرا" کی تعریف میں آتی ہی نہیں نا!

مولانائے محترم نے صاف گوئی سے کام لے کر یہ حقیقت فاش کر دی ہے کہ "آج کی مسلم دولتوں کا ملکی نظام نہ صرف یہی کہ ترویجِ اسلام کا معین نہیں بلکہ اس کی راہ میں ایک مستقل رکاوٹ اور تبلیغ حق کے لئے ایک محکم سنگِ راہ ثابت ہو رہا ہے" لیکن اس رکاوٹ کو ہٹانے میں کتنے "مبلغین" حصہ ادا کر رہے ہیں اور جو اس کام میں لگے ہیں ان کے ساتھ "مستند اربابِ دعوت و اصلاح" کا سلوک کیا ہے؟

بہر حال رسالہ بڑا قابلِ قدر ہے۔

"سیارہ بین"

مؤلفہ: شیخ عبدالملک صاحب کرنال شاپ، انارکلی، لاہور۔
شائع کردہ: گوشۂ ادب لاہور

قیمت: مجلد مع گرد پوش تین روپے۔

کاروباری دنیا، روپے اور منافع کے محور پر گھومنے کی وجہ سے "دل و دماغ" کے لحاظ سے بالعموم دیوالیہ ہی رہتی ہے۔ لیکن شیخ عبدالمالک صاحب نے زبردستی اپنے لئے استثنیٰ کا مقام حاصل کر لیا ہے۔ شیخ صاحب کی لکھی ہوئی ایک کتاب پہلے بھی ہمارے سامنے آئی تھی اور اب یہ دوسری فنی تالیف پیش نظر ہے۔ ہمارے ہاں کے ہر "سیلزمین" کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے ۔۔۔ بلکہ شیخ صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہر شخص سیلزمین ہوتا ہے اور کامیاب زندگی سیلزمین بنے بغیر کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ بات کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی کہ ایک فنی تالیف میں "پروپگنڈے" کا عنصر نمایاں طور پر موجود ہے۔

کلمۂ طیبہ کی حقیقت

مؤلفہ: جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی۔

شائع کردہ: مکتبۂ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

قیمت: آٹھ آنے

مولانا الیاس مرحوم کی برپا کردہ دینی تحریک کا محور کلمۂ طیبہ ہے۔ اس تحریک کے ایک اہم خادم نے کلمۂ طیبہ کے مفہوم، اس کی شرح اور حقیقت کے بارے میں یہ پمفلٹ علمی انداز سے مرتب فرمایا ہے عبادت و استعانت کے باہم لازم و ملزوم ہونے کی وضاحت بہت مفید ہے۔

البتہ یہ چیز کھٹکتی ہے کہ مولانا کے نزدیک اللہ تعالیٰ کو مالک و حاکم ماننا توحید کا "ثانوی مطالبہ" ہے اور یہ مطالبہ "عبادت و استعانت" سے کچھ الگ سا ہے۔

توحید کے انسانی سیرت پر جو عملی اثرات رونما ہونے چاہئیں ان کو بھی مولانا نے بڑی خوبی سے اجمالاً پیش کر دیا ہے۔

"توحید کامل کے مقام تک پہنچنے کا "نصاب" یہ تجویز کیا گیا ہے کہ "اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے ذکر کی کثرت کی جائے یعنی تسلسل اور تکرار کے ساتھ دل اور زبان ہم آواز ہو کر ادا کیا کریں" اور یہ کام "کسی صاحب دل شیخ کی تلقین اور نگرانی میں ہونا چاہیئے"

کلمہ کے دوسرے جزء "محمد الرسول اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول ماننے کے تین تقاضے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ اجمالاً حقوقِ رسالت سامنے آجاتے ہیں۔

OUR ENGLISH LITERATURE :

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study. PP. 231–Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi —This treatise deals with nationalism and its bearing on Islamic ways of thought and life, and present social and political problem in India. PP. 72–Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet. PP. 64–Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56–Price As. 12

5. **Economic Problem of Man & its Islamic Solution** —By Sayyed Abulala Maudoodi. PP. 56–Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944 PP. 56–Price As. 12

7. **The Message of Jama'at-e-Islami**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered in a gathering of the Jama'at which was held on 9th & 10th May, 1947 in Dar-ul-Islam, Pathankot. PP. 36–Price As. 8

8. **What is Islam ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi. PP. 96–Price Re. 1/8

9. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56–Price As. 12

Can be had from

MAKTABA-E-JAMA'AT-E-ISLAMI

LAHORE

(Pakistan)

سرورق رپن پریس، لاہور میں چھپا